فکر و نظر

سوال کی اہمیت

یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ گرمیوں کی رُت تھی اور حبس کے دن۔ گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹ جہلم کے انگریزی کے استاد (اور کالج کے پرنسپل) سید سلیم شیرازی صاحب نے کہا کہ باہر بیٹھتے ہیں۔ انٹر کامرس کے دوسرے سال کی کلاس مختصر تھی طلبہ نے کرسیاں اٹھائیں اور درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ استاد گرامی نے پڑھاتے ہوئے ایک طالب علم سے کوئی سوال کیا۔ وہ جواب نہ دے سکا۔ کئی اور طلبہ سے وہی سوال پوچھا لیکن کسی کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنکارا بھرا اور کہا ''دنیا میں ۹۸ فیصد لوگوں کو سوال کرنا نہیں آتا اور ۹۹ فیصد لوگوں کو جواب دینا نہیں آتا۔''

آج نصف صدی ہونے کو آئی وہ منظر ہماری آنکھوں میں اسی طرح واضح ہے جیسے سامنے جلتا ہوا بلب جس کی روشنی میں ہم لکھ رہے ہیں۔ زندگی میں جب بھی ہم کسی کو بے تکا سوال کرتے سنتے ہیں یا کسی کو بے ڈھب جواب دیتے دیکھتے ہیں تو استاد مرحوم کے الفاظ ہمارے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔ اللہ استاذ گرامی کی قبر کو نور سے بھر دے، انہوں نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا تھا اور ہمیں بھی انہوں نے بہت کچھ سکھایا (آمین)۔

البرہان کا اسلوب یہ ہے کہ ہم سوال بھی اُٹھاتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں اور اللہ کا کروڑوں شکر کہ اس نے تھوڑا سا علم اور شرح صدر عطا فرمایا اور ہم پی ایچ ڈی کی کلاس میں بھی یہی کہتے ہیں کہ کوئی بھی سوال پوچھ لو۔ لیکن اس دفعہ جب 'فکر و نظر' ہمیں دوبار لکھ کر پھاڑنا پڑا تو ہم نے سوچا کہ جواب دینے کی بجائے آج ہم سوال اُٹھاتے ہیں اور سوال اٹھانا بھی آسان نہیں ہوتا بلکہ اصل بات تو صحیح سوال اور صحیح انداز میں سوال اٹھانا ہی ہوتی ہے کیونکہ اگر سوال آپ کو صحیح رخ میں سوچنے پر مجبور کر دے تو آدھا جواب تو سمجھیے حاصل ہو گیا۔

ہمارا آج کا سوال یہ ہے کہ دہشت گردوں نے پشاور کے آرمی پبلک سکول پر حملہ کیوں کیا؟ آپ اس 'کیوں' کا ذرا پیچھا کریں مثلاً اگر کوئی جواب دے کہ وہ تو دہشت گرد تھے اور انہوں نے تو دہشت گردی ہی کرنی تھی۔ تو یہ سوچیے کہ وہ دہشت گرد کیوں تھے؟ یعنی وہ دہشت گرد کیوں بنے؟ کس نے انہیں دہشت گرد بنایا اور کیوں بنایا؟ اور اگر کوئی کہے کہ وہ ہمارے دشمن کے بھیجے ہوئے ایجنٹ تھے، تو پھر سوچیے کہ ہمارا وہ دشمن کون ہے؟ وہ ہمارا دشمن کیوں بنا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ اس دشمن کا ہمارے ساتھ رویہ کیا ہے؟ اور ہمارا اس کے ساتھ رویہ کیسا ہے؟ اور ہم نے اس دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اور ہم اس دشمن کا مقابلہ کیسے کر رہے ہیں؟

تعلیم و تربیت　　سید خالد جامعی ☆

اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟

ہر کتاب کو اسی زاویے سے دیکھیے

یہ ۲۰۱۱ء کی بات ہے ہمارے عزیز دوست عمیر ثانی ایک بین الاقوامی ادارے Trade Key کے شعبہ کمپیوٹر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور جدید دنیا سے بخوبی واقف۔ ایک دن انہوں نے اپنے بچے کی تعلیم وتربیت سے متعلق بعض استفسارات کیے اور بچے کے بدلتے ہوئے رجحانات، نت نئے میلانات کے بارے میں سوالات اٹھائے جو پری نرسری میں پڑھ رہا تھا تو راقم نے عرض کیا آپ کا بچہ کہاں پڑھتا ہے؟ معلوم ہوا کراچی کے سب سے بہترین اور مہنگے ترین اسلامی اسکول Generation میں پڑھتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اسکول چند مہینوں بعد یونیورسٹی میں تبدیل ہونے والا ہے عملے کا تقرر ہو چکا ہے۔

جنریشن اسکول کی نگراں ڈاکٹر غزالہ صدیقی صاحبہ نہایت نیک سیرت، متحرک، موثر مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان خاتون ہیں۔ ان کے شوہر عرفان صدیقی میزان بینک کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ جنریشن اسکول میں اسلامی اقدار، روایات، حجاب، حیاء کا خاص خیال بھی رکھا جاتا ہے لہٰذا ہم نے عمیر ثانی صاحب سے کہا کہ آپ کا بچہ جو انگریزی کتابیں پڑھتا ہے وہ لے آیئے۔ عمیر صاحب دوسرے دن کتابیں لے آئے۔ آکسفرڈ کی شائع کردہ ان کتابوں کا راقم نے ناقدانہ جائزہ لیا اور یہ جائزہ عمیر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عمیر صاحب نے اگلے ہفتے اپنے بچے کا داخلہ منسوخ کرا دیا۔ یہ جائزہ جنریشن اسکول کے اساتذہ کی خدمت میں بھی تفکر، تدبر اور تنقید کے لیے پیش کیا گیا جن کا جواب صرف یہ تھا کہ ہم نے تو ان کتابوں کا کبھی اس طرح جائزہ نہیں لیا نہ ان کتابوں کو اس قدر گہرائی سے دیکھا ہے۔ اساتذہ خود حیرت، تعجب میں مبتلا تھے۔ ۲۰۱۴ میں ہمارے ایک دوست نے جو ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر فنانس کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کا بچہ بھی جنریشن اسکول میں پڑھتا ہے، ہمیں بتایا کہ ان کا بچہ بہت اداس اور افسردہ ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ ابو ہمارے گھر میں سب کچھ ہے مگر سوئمنگ پول (تیراکی کا حوض) کیوں نہیں ہے؟ بچے کے گھر میں دنیا کی ہر نعمت ہے صرف پانی کا حوض نہیں ہے تو اسے اپنا گھر حقیر نظر آتا ہے۔ ھل من مزید کا یہ طرز فکر، یہ احساس محرومی، بے بسی و بے کسی کا یہ اسلوب کس نے پیدا کیا؟

جدیدیت [Modrenism] کے پیدا کردہ معیار زندگی اور اس معیار میں مسلسل و

☆ ناظم شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

مستقل اضافہ کا اصول ایک معصوم بچے کو بھی نفس مطمئنہ سے محروم کر دیتا ہے۔اس مسئلے کی بنیاد تلاش کرنے کے لیے ہم نے اپنے دوست کی خدمت میں تین سالہ پرانا تجزیہ پیش کیا۔ یہ تجزیہ ایک آئینہ ہے جس میں بہت سے مخلص، راسخ العقیدہ، متقی، پرہیز گار، لوگوں کے قائم کردہ اسلامی اسکولوں کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔تصویر جیسی بھی ہوا سے غور سے دیکھیے آئینے کو توڑنے کی کوشش نہ کیجیے صرف اس تصویر کو بدلنے کی کوشش کیجیے جو ہماری خواہش، آرزو، جستجو کے بغیر نادانستہ طور پر ہمارے آئینے نے تخلیق کردی ہے صرف ایک سوال پر مسلسل غور کرنے کی ضرورت ہے۔کیا اس تصویر کو بدلا جاسکتا ہے؟

ایک نقطہء نظر یہ ہے کہ جدید تعلیمی ادارے ہماری تاریخ نے تخلیق نہیں کیے یہ ہم پر مسلط کیے گئے ہیں اس نظام کو فی الحال بدلنا ممکن نہیں ہے اور ریاستی قوت کے بغیر اس کا فوری متبادل پیش کرنا بھی اس وقت ممکن نہیں لہٰذا ہم حالت اضطرار میں ہیں لیکن لمحۂ موجود میں امریکہ کینیڈا میں جدید اسکولوں کا متبادل گھر اسکول، امی اسکول اور ابو اسکول [Home School/ Mom School/ Dad School] وجود میں آچکے ہیں دنیا کی تئیس تہذیبوں کی طرح گھروں بستیوں محلوں میں قائم یہ غیر تجارتی [Non Commercial] مکتب جو ہمارے شاندار ماضی کی یادگار ہیں مغرب کے موجودہ نظام تعلیم کے لیے موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں سے بہت اچھے، سستے اور بہت بہتر طلباء تیار کر رہے ہیں جو اخلاقی طور پر اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت برتر ہیں۔ یہ اسکول ماں باپ نے خود اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیے ہیں کیونکہ صرف مادی کامیابی کے لیے تخلیق کیے گئے جدید اسکول مغرب کے بچوں کی مادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں اور بے شمار سنگین مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مکتب قائم کرنے والے بہت مذہبی لوگ بھی نہیں ہیں۔ان کا مقصد بچوں کی اخلاقی روحانی ایمانی نورانی تربیت بھی نہیں ہے محض مادی احساس زیاں یعنی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کی خواہش آرزو اور جستجو نے ان کو ایک نئے تجربے اور متبادل نظام پر آمادہ کیا اور وہ صرف مادی طور پر کامیاب ہوگئے۔اس خالص مادی ترقیاتی تجربے کو ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر کے ایک سوال اٹھاتے ہیں۔کیا جدید سیکولر تعلیمی اداروں میں اصلاحی، دفاعی اور انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ان اداروں کی بنیادوں اور مرتبہ نصاب میں موجود زہر کا علاج ممکن ہے یا نہیں؟ ان میں اصلاح کا کتنا امکان ہے؟ یہ ہمارے سوچنے کا اصل میدان ہے۔

مغرب کے تمام ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام کے نظریات لبرل ازم، سوشلزم اور سوشل ویلفیئر ازم پر یقین رکھتے ہیں ان کا اجماع اصولاً آزادی، مساوات اور ترقی کے عقائد پر ہے یہ خدا، نبی، آخرت وغیرہ کے قائل نہیں۔ان کا نظام تعلیم بھی انہی عقائد کے مطابق بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔تعلیم کا مقصد محض ترقی، لذتوں کا حصول آزادی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافہ ہے۔ اس کے باوجود ایک مغربی سوشلسٹ ملک نے اسی مفاد پرست، حاسد، حریص تعلیمی نظام میں چند بنیادی

اصلاحات چند ترمیمات اور اضافوں کے ذریعے ڈاکٹر بننے والوں میں حرص وحسد وہوس کے جذبات پیدا کرنے کے بجائے قوم پرستی اور انسان پرستی کے ذریعے خدمت خلق کا ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے طبی مشن اس ملک کے ڈاکٹروں اور طبی عملے پر مشتمل ہیں جو مختلف غریب کمزور ممالک میں بلا معاوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بیک وقت چھپن ہزار لوگ اس عمل میں شریک ہیں۔ مگر ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے ملک کی شہریت قبول نہیں کرتا جبکہ اس ملک میں ڈاکٹروں کی تنخواہیں بہت کم بلکہ دنیا میں سب سے کم ہیں۔ تفصیلات کے لیے نوم چومسکی کی کتاب Profit over people کا مطالعہ کیجیے۔ بڑے بڑے عالمی ادارے، UNO، UNO،OXfam،WHO،UNICEF ، ریڈ کراس بھی اربوں کھربوں روپے کے فنڈ وصول کرنے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر مفت طبی امداد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

کفار اگر کفر کے نظام تعلیم میں تجربات کے ذریعے کچھ اصلاحات کر سکتے ہیں تو امت مسلمہ جو پندرہ سو سال کی تاریخ رکھتی ہے وہ اس نظام تعلیم میں جزوی اصلاحات کے لیے بھی کیوں آمادہ نہیں ہے؟ اور کیا وجہ ہے عالم اسلام ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے؟ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذکورہ ملک کا تجربہ عالم اسلام کے لیے کوئی عالی معیاری اور مثالی نمونہ ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تبدیلی کی خواہش ارادہ اور عزم ہو تو ہر طرح کے مشکل حالات اور سخت سے سخت نظام میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدیدیت کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے مغلوب، مسحور اور مرعوب ہو گیا ہے بلکہ وہ جدیدیت کے تمام مظاہر و آثار اسلامی تاریخ میں تلاش کر رہا ہے۔ جزئیات کی بنیاد پر کلیات اخذ کر کے مغربیت جدیدیت اور لادینیت کی اسلامی تعبیریں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا عقل صرف ان امور میں استعمال کی جارہی ہے جہاں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں اور جہاں عقل کی ضرورت ہے وہاں مغرب کی کامل تقلید اختیار کر لی گئی ہے۔ مغرب کے فلسفے اس کے علوم اور اس کے اداروں کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بجائے ہم اسلامی علمیت، اس کے مکاتب فکر، ان کے اور اختلاف اسلام کے اداروں میں اس کی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لینے میں مصروف ہیں لہٰذا مغرب محفوظ ہے اور اسلام مضروب، مجروح اور محبوس ہے۔

سرسید احمد خان عالم اسلام میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں سرسید نے دوسو سال پہلے جدید سیکولر تعلیم کا آغاز کیا مگر اس وقت بھی انھیں یقین تھا کہ ''جدید تعلیم کے نتیجے میں ہندو مسلمان عیسائی کے دل میں بھی مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ ان کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جا رہا ہے'' [حالی، حیات جاوید، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشر لاہور ۱۹۸۴ء طبع اول، ص ۲۲۴،۲۳۳، باب پنجم]۔ تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو

روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی جس سے مفر نہ تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں یہ تعلیم پھیلانی پڑی حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے [حیات جاوید دوسرا حصہ ص۱۳۴،محولہ بالا] لیکن سرسید کی رائے تھی کہ اس تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے لہٰذا یہ ناگزیر برائی ہے لہٰذا اس کی خرابیوں کا ازالہ ہونا چاہیے مگر عالم اسلام کے ماہرین تعلیم اور اسکولوں کے منتظمین میں عموماً اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جدید تعلیم کس طرح فکری ارتداد پیدا کرتی ہے اور اس کا امالہ کیسے ہونا چاہیے۔

سرسید احمد خان نے جدید سیکولر مغربی تعلیم کے مذہب دشمن اثرات سے بچانے کے لیے قرآن کی جدید تفسیر لکھی جس کے نتیجے میں جدید نسل کی اصلاح تو کیا ہوتی البتہ اسلامی علمیت کی بنیادیں منہدم ہوگئیں لیکن سرسید کی فکرمندی ہمارے لیے قابل غور ہے۔حالی لکھتے ہیں'الغرض ان کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے ہونے کا اندیشہ ہے ان کا انسداد کیا جائے۔اس مقصد کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے'[حیات جاوید،ص ۲۲۶] اسلامی تاریخ میں علم کلام دین پر ہونے والے حملوں کا دفاع کرتا اور عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے اور اعتراضات وشبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔سرسید چراغ علی اور شبلی نے جو علم کلام ایجاد کیا اس نے اسلامی علمیت پر ہونے والے تمام اعتراضات کو ہی قبول کرلیا لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک نئے علم کلام کے لیے بھی کوئی محنت نہیں کی بلکہ اس سیکولر نظام تعلیم کو ہم اپنا سمجھ کر قبول کر چکے ہیں۔اس تقلید کے باعث ہم آج تک اس نظام کی تنقید تخلیق نہیں کر سکے۔

عجیب حکایت ہے کہ ایک انسان ایک شیر کے ساتھ کسی شہر کی سیر کر رہا تھا۔سیر کرتے کرتے وہ ایک نمائش گاہ میں داخل ہوئے جہاں مصوری کے شاہکار رکھے ہوئے تھے۔ایک شاہکار میں ایک شیر کو دکھایا گیا تھا جو زمین پر بے سدھ،بے یار و مددگار حیران و پریشان،ہکابکا،نیم جاں پڑا ہوا تھا۔شیر کی گردن پر ایک قوی ہیکل شکاری نہایت شان بلکہ تکبر کے ساتھ پیر رکھ کر مسکرا رہا تھا۔اس کی کمر میں ایک بندوق بھی جھول رہی تھی۔انسان نے شیر سے پوچھا:یہ تصویر کیسی ہے؟شیر نے کمال بے نیازی سے تصویر کو دیکھا اور جواب دیا ''یہ تصویر انسان نے بنائی ہے'' دوسرے معنوں میں یہ تصویر شیر نے نہیں بنائی ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔سوچنے کا یہ زاویہ زندگی،حرکت،حرارت اور تازگی کی علامت ہے۔یہ زاویۂ نظر کسی لمحے بھی انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا بدترین عذاب کسی قوم پر یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم فکرِ صحیح سے محروم ہوجائے۔فکر صحیح ہو تو راکھ سے بھی نشیمن تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ذرہ صحراء،پتی گل۔گل گلزار۔دریچہ دروازہ اور دروازہ دیوار بن سکتا ہے۔

جدید سیکولر تعلیمی ادارے ہم نے نہیں بنائے۔دنیا کی تیئس تہذیبوں میں اس طرح کے تعلیمی اداروں کا کوئی وجود نہیں ملتا۔دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی نظام تعلیم مادہ پرستی،شکم اور شہوت پرستی کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا گیا۔ہر تعلیمی نظام کسی اعلیٰ ترین تصورِ خیر [Meta Narrative] کی فوقیت اور فروغ کا

فریضہ انجام دیتا تھا۔تعلیم کا مقصد روٹی کمانا نہیں تھا۔علم حقیقت مطلقہ [Absolute Reality] اللہ رب العزت کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔مگر عصر حاضر میں تعلیم کا اصل مقصد آزادی، مساوات اور ترقی کا حصول ہے لہٰذا علم وہ ہے جس سے مال و دولت کثرت سے حاصل ہوتے ہوں لہٰذا ہر شخص حصول دولت کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔یہ محض دعویٰ نہیں ہے اس کی دلیل بھی موجود ہے۔اگر آج دنیا کی تمام حکومتیں اعلان کر دیں کہ کسی سرکاری غیر سرکاری یونیورسٹی سے سند لینے والے کو کسی ادارے میں ملازمت نہیں ملے گی تو تمام اسکول یونیورسٹیاں ویران ہو جائیں گی۔یہ تعلیم علم کے لیے نہیں روٹی کمانے کے لیے ہے۔اس کا تعلق العلم سے نہیں صرف عقلی علوم، سائنس سوشل، سائنس، آرٹ، کرافٹ اور فنون سے ہے جسے دنیا کی تئیس تہذیبوں میں علم نہیں سمجھا جاتا تھا اور تجربی، سائنسی، حسی، عقلی علوم کو علوم کی تلچھٹ کہا جاتا تھا اسی لیے سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں سوفسطائیوں کو شکست ہوئی تھی جو پیسے لے کر فنون بیچتے تھے اور اسے علم کہتے تھے۔علم خرید و فرخت کی شے نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر بچہ اسکول کالج اور یونیورسٹی سے علم حاصل کر کے پیسہ نہ کمائے تو کیا کرے؟ علم سے شعور، اعتماد، عزت، دولت، شہرت ملتی ہے تو اس کے حصول میں کیا ہرج ہے؟ یہ دلیل بہ ظاہر مضبوط ہے لیکن کم زور ہے کیونکہ اب دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے علم نہیں کرتب بازی کی ضرورت ہے مثلاً فٹبال کرکٹ، اسکواش کھیلنے والے جاہل کھلاڑی ارب پتی بن جاتے ہیں۔فلم اور ٹی وی میں کام کرنے والے جاہل اینکر پرسن، پانسے پھینکنے والے سٹے باز [Risk Managers]، جاہل صحافی، مسخرے بھانڈ، اداکار اور کسبیاں کھربوں روپے کماتے ہیں۔ جاہل سٹے باز، حجام، درزی (جن کو اب فیشن ڈیزائنر کہتے ہیں) آرٹسٹ، فوٹو گرافر، مصور، ماڈل اور رقاص اعلیٰ تعلیم کے بغیر اتنا دھن کماتے ہیں کہ انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔عزت اسی کو ملتی ہے جو مال و دولت میں سب سے آگے ہے لہٰذا یہ سمجھنا کہ علم سے دولت ملتی ہے جدیدیت اور مغربیت سے ہماری ناواقفیت کا عمل ہے۔کنیڈا میں ٹرک ڈرائیور ڈاکٹر سے زیادہ پیسے کماتا ہے اور برطانیہ میں تندور پر روٹی لگانے والے کی تنخواہ ڈاکٹر سے زیادہ ہے۔

ٹنڈو جام یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا حجام بننا چاہتا ہے۔صحافی کو حیرت ہوئی تو جواب ملا: جن دنوں میں امریکہ میں مقیم تھا ہمارے محلے میں ایک حجام تھا جس سے ہم بال کٹواتے تھے اس کی آمدنی مجھ سے کئی گنا زیادہ تھی تو بیٹے نے کہا کہ ابو آپ سے بہتر تو یہ حجام ہے جو اتنا کما لیتا ہے۔جب تہذیب کا نقطۂ کمال مال کی فراوانی اور تعیش کی ارزانی ہو تو یہ تصورِ خیر ایک نئے انسان کی تعمیر کرتا ہے جسے ہم جدید انسان [Modren Man] کہتے ہیں جدید تعلیمی اداروں سے ایسے ہی لوگ نکلتے ہیں۔

جاہل سیاست داں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور راتوں رات کروڑ پتی ،

ارب پتی پھر چند سالوں میں کھرب پتی ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا صرف پاکستان اور تیسری دنیا کے مما لک میں ہوتا ہے لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ اور بھارت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ریگن ہالی ووڈ کا ایک اداکار امریکہ کا صدر بن سکتا ہے اور واجپائی، مودی جیسے جاہل بھارت کے وزیر اعظم بن جاتے ہیں۔ جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے اس کی تفصیل جاننے کے لیے نیوز ویک کے سابق مدیر اور صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن فرید زکریا کی کتاب *The Future of Freedom* پڑھیے، دنیا بھر کی جمہوریتوں کے جاہل سیاستدانوں کی تاریخ آپ کو مل جائے گی۔ فرید زکریا نے لکھا ہے کہ امریکہ میں ۸۵ فی صد فیصلے کانگریس اور سینٹ میں عوام کے نمائندے نہیں کرتے بلکہ لابیاں، پریشر گروپ اور مختلف گروہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے الیکشن جیتنے (اور ہارنے) کے لیے کھربوں روپے کی امداد دینے والے اپنے مفادات کیوں حاصل نہ کریں؟ تعلیم، سیاست، علم سب کا ایک ہی مقصد ہے سرمایہ میں اضافہ جس سے آزادی میں اضافہ ہوتا ہے یہی عہد حاضر کا مذہب ہے۔ اسے سرمایہ دارانہ نظام بھی کہتے ہیں۔

جدید اسکول ہمیں وہ سانچے مہیا کرتے ہیں جن کے ذریعے ہم استعمار کی غلامی قبول کرتے اور اس کے پیدا کردہ مقاصد زندگی کو الحق سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے مغرب کے مقابلے پر ہماری سیاسی عسکری شکست کو تہذیبی شکست میں بدلتے ہیں اور نوکری اور ترقی کو زندگی کا اصل مقصد بنا کر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مسلسل و مکمل رہنمائی اور بھاری بھرکم نصاب کے ذریعے کچل کر رکھ دیتے ہیں سوچنے جانچنے پرکھنے کے تمام فطری پیمانوں کو توڑ کر صرف ایک طریقے سے سوچنا سکھاتے ہیں۔ مارکوزے کے الفاظ میں یک رخا آدمی (One dimensional man) پیدا کرتے ہیں جو صرف مغرب سے ہی وفادار رہ سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کے لیے دین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں عقل کا استعمال ممنوع و حرام ہو جاتا ہے۔ عقل صرف دین پر تنقید اور دین کی جدید تعبیر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ نظام تعلیم و تربیت اتنا مہلک ہے کہ جہاں عقل استعمال کرنی چاہیے وہاں دین کو لے آتے ہیں اور جہاں دین، روایت، نقل، وحی پر اعتماد کرنا چاہیے وہاں عقل لے آتے ہیں۔ لہٰذا جدید تعلیمی نظام سے جو خلق جدید برآمد ہوتی ہے وہ مذہب اور اسلام پر ہونے والے کسی اعتراض کا جواب دینے کے قابل نہیں ہوتی اور ہر اعتراض کو حقیقت سمجھ کر قبول کرتی اور اپنی تاریخ اور تہذیب سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

جدید دور میں سب سے زیادہ آمدنی [Incom] سٹے باز [Risk manager] کی ہوتی ہے اس کے پاس صرف قیاس، گمان، ظن، تخمین کا علم ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک خاص حس، جذبہ، حوصلہ اور ولولہ ہوتا ہے جس کا علم اور سند کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی۔ دنیا کا سب سے بڑا سٹہ باز جارج سوروس [I] [Soros] بس اندازے پر کھیلتا ہے وہ کھرب پتی ہے۔ اس نے ملیشیا کی معیشت کو اسٹاک مارکیٹ کے ذریعہ

تباہ کر کے ایشین ٹائیگر کو ایک رات میں پیپر ٹائیگر بنادیا تھا۔اس عالمی سٹے باز کی بے پناہ آمدنی اور علم سے متعلق تفصیلات کے لیے نائیل فرگوسن کی کتاب *The Ascent of money* پڑھ لیجیے۔

جدیدیت [Modrenism]، لادینیت [Secularism] اور سرمایہ داری و جمہوریت [Capitalism & Democracy] کی پیدا کردہ جدید دنیا میں شہرت عزت اور دولت کا معیار علم نہیں ہے بلکہ سائنسی علم بھی نہیں بلکہ علم کا معیار یہ ہے کہ کون اپنے کام،فن سے سب سے زیادہ سرمایہ پیدا کرسکتا ہے کیونکہ آزادی صرف سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے۔اسی لیے مغرب میں کام [Work] کی تعریف یہ ہے کہ جس سے سرمایہ حاصل ہو۔کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے یعنی جو شخص کام نہیں کرتا سرمایہ نہیں کما تا وہ اپنی آزادی کا انکار کرتا ہے۔آزادی مغرب کا بنیادی ایمان و عقیدہ ہے لہٰذا آزادی اور سرمایہ کا منکر پاگل ہے۔فوکالٹ لکھتا ہے The absence of work is madness اسی لیے گھر میں تیرہ بچوں کو پالنے والی عورت کے کام کو مغرب کام تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے سرمایہ نہیں پیدا ہوتا۔یہ عورت باہر جائے کمائے تو اسے working woman کہتے ہیں۔ رنڈی اپنی ملکیت جسم کو بیچ کر سرمایہ کما کر اپنی آزادی میں اضافہ کرتی ہے لہذا اسے طوائف نہیں sex worker کہتے ہیں۔محنت کے ذریعے آزادی اور سرمایہ جیسے عظیم کام انجام دینے والی عورت ۔جدید سیاسی فلسفے کا سب سے بڑا مفکر جان رالز جس کی کتاب *Theory of Justice* جدید ریاستوں میں عدل کے موضوع پر انجیل سمجھی جاتی ہے۔وہ لکھتا ہے کہ ہر انسان کو چار بنیادی خیر [Four Primary Goods] حاصل ہونے چاہئیں۔آمدنی ، دولت، قوت اور اقتدار [Incom/ Wealth/ Power/ Authority] ان چار بنیادی خیر کے بعد ہی کوئی شخص اپنی آنکھوں میں عزت وتکریم [Self Respect] کے قابل ہوسکتا ہے۔دوسرے معنوں میں کوئی شخص اپنی نگاہ میں بھی ان چار بنیادی اسباب کے بغیر عزت کے قابل نہیں۔جس شخص کو اپنی نگاہوں میں ان چار عقائد کے بغیر عزت حاصل نہیں اسے دوسرے کی نگاہوں میں عزت کیسے مل سکتی ہے؟ جدید نظام تعلیم ہمیں یہی عزت دلانے کا فریضہ انجام دیتا ہے کہ عزت کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں۔دوسرے معنوں میں ہمارے عقیدے،ایمانیات اور ما بعد الطبیعیات بھی بدل چکے ہیں لہٰذا جس کے پاس مال و دولت اور اسباب کی فراوانی نہیں ہے وہ عزت کے قابل ہی نہیں ہے افسوس کہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے لوگ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتے۔

دنیا بھر میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً سائنس کو برتر علم جانا جاتا ہے لیکن سائنس دان [Scientists] کی مغرب میں اتنی عزت نہیں کی جاتی جتنی عزت سٹے باز رنڈیوں ، مراثیوں، بھانڈوں [Showbuisness Stars] اور کھلاڑیوں [Sports men] کی ہوتی ہے۔عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید [Modren Age] میں صرف مادی ہے اور وہ ہے پیسہ۔جو زیادہ کماتا

ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ۔ اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں مثلاً عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرسکتیں۔صرف امریکہ میں عریانی فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکروسافٹ جیسی کمپنی بھی شامل ہے)اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے۔

World wide porn revenues topped 97 billion Dollar in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, Google. Amazon, e Bay, Yahoo, Apple, Net flix & Earth link combined. [Chris Hedges., *Empire of illusion : The end of literacy & the triumph of spectalce* , Nation Books USA 2009, p. 58]

لہٰذا زیادہ اجرت [Salaries/wages] اسے ملے گی جو زیادہ سرمایہ پیدا کرے گا۔ برکلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ یونیورسٹی کے فٹبال کوچ سے کم ہے۔فٹبال کوچ سالانہ تین ملین ڈالر کماتا ہے اور وائس چانسلر تین لاکھ ڈالر بھی نہیں کماتا۔ایک فٹبال میچ سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے برکلے اتنا سرمایہ کئی سالوں میں نہیں پیدا کرسکتی۔کرس ہیجز اپنی کتاب *The Empire of Illusion* میں لکھتا ہے:

The football coach is Berkeley's highest paid employee. He makes about 3 million dollar. [p. 94]

کرس ہیجز اسی کتاب کے باب Illusion of Love میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں ایک اعلیٰ ترین رنڈی تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ کماتی ہے۔ آج کل اسے آرٹسٹ، فلم اسٹار، فلمی ستارہ sex worker کہا جاتا ہے لیکن اس پیشے کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے سب سے بہترین لفظ یہی ہے۔

The porn stars make anywhere from 1500 dollar to 3000 dollar an hour as prostitute. [p. 68, ibid]

(جاری ہے)

مغربی فکر و تھذیب

پروفیسر کلاڈ الویرز☆

مغرب زدہ عمرانی علوم کا تنقیدی جائزہ

عمرانی علوم اور حقیقی دنیا

جنوری ۲۰۱۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات نے اپنے احاطے میں ایک نئے 'یورپین اسٹڈی سنٹر' کا افتتاح کیا جس کے لیے مالی اعانت یورپی یونین نے کی۔اس مرکز کا مقصد یورپی اہل علم کی مدد سے عمرانیات میں ایم اے اور ایم فل کے موجودہ نصاب کو نئی شکل دینا ہے۔اس مرکز کے دوسالہ پروگرام کے لیے یورپی لوگ تین لاکھ یورو دینے کو تیار تھے۔[1]

سیدھا سا سوال جو ہم پوچھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ: جب اس ملک میں موجود دیگر تمام جامعات کے عمرانیات کے شعبوں کی طرح، دہلی یونیورسٹی کا شعبہ عمرانیات بھی اپنے قیام کے اول روز ہی سے یورپی عمرانیات پڑھا رہا ہے تو اس پروگرام کو شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

دور غلامی میں یورپی فکر پر انحصار اور غلامانہ ذہنیت، نوآبادیاتی نظام کا منطقی نتیجہ تھی اور آج اسے اس لیے خوش آمدید کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ نقد رقم بھی آتی ہے۔

مالی امداد حاصل کرنے کے چکر میں پھنسی ہوئی جامعات، جو موجودہ تشکیلی مطابقت (Structural Adjustment) کے مستقل دور کی دلدل میں دھنس چکی ہیں، ان کے لیے تعلیمی سرگرمی جاری رکھنے کا واحد راستہ یہی باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہی کیوں نہ ہو کہ آپ دوسرے افراد کے دماغ کی پیداوار یا مصنوعات کو اپنا اور پھیلا کر اپنی روزی کما رہے ہیں☆☆۔

یورپین اسٹڈی سنٹر کی تجویز میں اشارتاً بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ یہ دو برابر کے گروہوں کے مابین کوئی شراکت ہے اور یہ کہ ہندوستانی، یورپیوں کے اپنے سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی مدد کریں گے۔ وہ سماجی مسائل جن کی وہاں بہتات ہے مثلاً اقلیتوں کو ضم کرنے کا مسئلہ، ثقافتی برادریوں کے درمیان باہمی تعلقات کا مسئلہ، اجنبی غیر ملکی باشندوں کا مسئلہ، ریٹائر ہو جانے والے ملازمین کی دیکھ بھال

☆ کوآرڈی نیٹر ملٹی ورسٹی پراجیکٹ، انڈیا

☆☆ پاکستان میں بھی اس طرح کی مثالوں کی کمی نہیں جیسے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تربیت اساتذہ میں ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کا قیام اور لاء کالج کو ہیومن رائٹس کی تدریس کے لیے گرانٹ۔

کے مسائل، گھریلو تشدد اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کے مسائل وغیرہ وغیرہ۔ ہم ابھی تک ایک ہی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ تمام حرکت 'برتر' یا 'ترقی یافتہ' تہذیب کی طرف سے 'کمتر' یا 'غیر ترقی یافتہ' تہذیب کی جانب ہے کیونکہ عالمگیر سطح پر جامعات میں علم کے نظام میں، علم کا بہاؤ اسی طرح سے ہے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ یونیسکو کی ورلڈ سوشل سائنس رپورٹ ۲۰۱۰ء میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یورپ سے باہر کی جانے والی سماجی سائنس کی تحقیق معیار میں اس قدر کم ہے کہ اس کا حوالہ ہی نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہ رپورٹ اشارہ کرتی ہے کہ شمالی امریکہ نے ایشیا اور افریقہ دونوں ہی جگہوں سے کسی بھی تحقیق کا حوالہ نہیں دیا۔[۲]

سیاسی سامراجیت کو تو آج شدید مزاحمت کا سامنا ہے (ایران، ویت نام، افغانستان، مصر) لیکن تعلیمی سامراجیت کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ یہ دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے برعکس ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنی شدت اور پھیلاؤ میں اضافہ کر رہی ہے۔

دنیا کی تقریباً تمام جامعات...... چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے...... یورپ کے تعلیمی دائروں میں رائج عمرانی علوم کے مقاصد اور طریقہ کار ہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں (فرید العطاس نے اس جانب 'عمرانی علوم کی طاقت' میں بھرپور انداز میں اشارہ کیا ہے[۳])۔ آج تک ان کا مقصد مغربی سکالرز کے نکات ہی پر غور و فکر کرنا رہا ہے۔ غیر یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے والی زیادہ تر عمرانی سائنس، عمرانیات کی مردہ لاش کے بے ذہن مطالعے یا مطالعے کی تکرار پر مبنی ہے۔ وہ علم جو نسلی مرکزیت کے جواب میں یا مخصوص طور پر یورپی حالات کے تصور میں عشروں یا صدیوں قبل تشکیل پذیر ہوا۔

آج کل، جہاں کہیں، حتیٰ کہ ایشیا اور افریقہ میں، تعلیمی کام ان محققین کی کوششوں سے، جو واقعی کوئی با مقصد کام کرنا چاہتے ہیں، مقامی معاملات سے متعلق ہوا ہے، وہاں بھی مروّجہ طریقہ کار، اور نظریاتی فریم ورک ابھی بھی بالکل ''یورپی امریکن'' ہے۔ نو آبادیاتی نظام سے آزادی پانے کا اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا کہ گزشتہ علمی آقاؤں کی جگہ پُر کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنے کا موقع مل گیا ہے۔ فطری طور پر، علمی اعتبار سے ایک بنجر دنیا میں اپنے وجود اور مقام کو دیکھتے ہوئے، ان کے لیے تخلیقی سوچ اور کام کی گنجائش بہت کم ہے۔

سماجی سائنس، جیسا کہ آج ہم اسے جانتے ہیں، یورپ کے سماجی مسائل کے حل کے لیے انہی کے مخصوص کردہ تحقیق کے کچھ خاص انداز اور طریقہ کار پر مبنی...... جو کہ یورپ کی علمی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں......اس یورپی تناظر کا نام ہے جس پر کوئی سوال ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ کیا یہ سائنس کبھی بھی دوسرے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے، جس کے نہ صرف مسائل بلکہ انسانی تجربات بھی انتہائی مختلف ہیں؟ علم کی اس ساخت کا اور یورپ سے باہر بسنے والے معاشروں کے افراد کی زندگیوں کے مابین کیا

'جذباتی' اور 'روحانی' تعلق ہوسکتا ہے؟

اس معاملے کا ایک اہم پہلو، ان طلبہ پر اس کے اثرات ہیں جو مختلف جامعات میں داخلہ لیتے ہیں۔ وہ اس مفروضے کے ساتھ وہاں آتے ہیں کہ ان کے نصاب کی معیاری مقدار دراصل غیر ملکی یا اجنبی ہے جو ان کے آس پاس کی دنیا یا ان کی ثقافت کے اہم عناصر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اس لیے انہیں مجبوراً اپنے متعلقہ مضمون کی زبان رٹنا پڑتی ہے، اس کے طے شدہ معیار، لغت، نعروں، درجہ بندیوں اور اس کے تصورات کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے، (اور یہ سب چیزیں فیشن کی طرح ہر چند سال بعد تبدیل ہوجاتی ہیں) تا کہ جب ان کا وقت آئے تو وہ بطور لیکچرر یا پروفیسر ان چیزوں کو اپنے طالب علموں کے سامنے دوبارہ اگل سکیں۔ اور یہ مہارت اور اعتماد صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کئی سال تک سر جھکا کر بنا سوال اٹھائے یا بنا تنقید کیے ہر چیز کی قبولیت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا جائے۔

مزید برآں، اپنی ہیئت کے اعتبار سے، یونیورسٹی ہر جگہ ہی اپنے حقیقی کردار اور مقصد کو بھول چکی ہے اور ایک ایسے فیکٹری اسکول کی ترقی یافتہ شکل اختیار کرچکی ہے جہاں علم کو کسی چیز کی مانند پھیلایا جاتا ہے اور طلبہ کے لیے کچھ تخلیق کرنے یا اپنا حصہ ڈالنے کا موقع کم ہی آتا ہے۔ دہلی کا یورپین اسٹڈی سنٹر اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ نوجوان طالب علم چار ہفتے کے دورے پر یورپ جائیں، جس کے تمام اخراجات سنٹر خود اٹھائے گا۔ اس دورے کے دوران انہیں موقع دیا جائے گا کہ سیمینارز کے ذریعے جدید ترین اصطلاحات کی بھنک ان کے کانوں میں بھی پڑ سکے اور وہ جدید ترین تحقیقات اور یورپ کے ماہرین تعلیم کے خیالات سے خود کو روشناس کراسکیں۔ یورپ کے اس تعلیمی طبقے کے جو پوری دنیا میں عمرانی علوم کے تصورات کے ضمن میں ابھی تک خود کو سب سے اوپر سمجھتا ہے۔

عمرانی علوم کے مطالعے کا تاریخی ارتقاء

کچھ لوگ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں: اگر ایسا ہی ہے تو ہندوستانی، ایرانی یا چینی لوگ اس سلسلے میں خود کو یہ اجازت کیوں دیتے ہیں کہ وہ یورپیوں یا امریکیوں کے مرتب کردہ عمرانی علوم ہی سے خود کو خوراک بہم پہنچاتے رہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہزارہا سال تک سماجی، سیاسی، سائنسی یا فوجی تنظیمات کی سوجھ بوجھ کے بغیر خود کو باقی رکھ سکیں؟ ہم اس نظریے کی مخالفت کرنے کے قابل کیوں نہیں ہیں کہ یورپی عمرانیات یا بشریات اور امریکی سیاسیات یا نفسیات ایک قسم کی حتمی چیزیں ہیں جن کے متعلق سوال نہیں اٹھایا جاسکتا؟ یا سادہ سی بات یہ ہے کہ ہم اس قدر سست ہیں کہ اس نوآبادیاتی ورثے کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتے اور نہ ہی نئی سوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں اس بات کا مختصراً جائزہ لینا مفید ہوگا کہ یہ صورتحال کس طرح پیدا ہوئی۔

یورپ اور پھر امریکہ کے سیاسی تسلط کے زیر اثر آنے والے نوآبادیاتی معاشروں کا عقلی جائزہ دو اہم مرحلوں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ پہلے نمبر پر ان کی عقلی اور روحانی روایات پر سوچا سمجھا حملہ کیا جاتا ہے جو اکثر اوقات اندرونی معاملہ بن جاتا ہے اور محکوم آبادی کا رہنما اور با اثر طبقہ بلا تنقید اسے قبول کر لیتا ہے۔ کسی بھی صورت میں ان کے پاس، کوئی اور راستہ بھی نہیں ہوتا۔

جبکہ دوسرے مرحلے میں مقامی نظام کو جو کہ محکوم آبادی کے تجربات پر مشتمل ہوتا ہے، برملا طور پر مکمل تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو طاقت کے استعمال کا عمومی اظہار ہے۔

اس قسم کے ثقافتی حملوں کے لیے استعمال کیے جانے والے طریقہ کار کو سر جان ڈیوس (Sir John Davies) نے، جو آئرلینڈ کے لیے برطانوی وکیل تھا، ۱۶۱۲ء میں اپنی کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ اس کتاب کا نام تھا:

A Discovery of the True Causes: Why Ireland was never Entirely Subdued and Brought under Obedience of the Crown of England Until the Beginning of His Majesty's Happy Reign.

(ان حقیقی اسباب کی دریافت جن کی وجہ سے آئرلینڈ عزت مآب شاہ کے خوشحال دور حکومت تک مکمل طور پر انگلینڈ کے تابع نہ ہو سکا)

اگرچہ وہ آئرلینڈ کے حوالے سے اپنی کتاب لکھ رہا تھا لیکن اس کی باتیں ہر اس ملک پر صادق آتی ہیں جو نوآبادیاتی طاقتوں کے سیاسی تسلط کے زیر اثر آئے۔

> ''وہ خامیاں جن کی وجہ سے آئرلینڈ پر مکمل فتح نہ پائی جا سکی، دو قسم کی تھیں، اور ان امور پر مشتمل تھیں: پہلے نمبر پر، جنگ کی کمزوری اور دوسرے سول حکومت کا کمزور نظام کیونکہ زمین کو اچھے بیج کے قابل بنانے کے لیے پہلے اسے توڑنا ضروری ہوتا ہے۔ جب اسے مکمل طور پر توڑ لیا جاتا ہے تو اس میں کھاد ڈال دی جاتی ہے۔ اس موقع پر کسان یا منتظم اس میں اچھا بیج نہ بوئے تو یہ پھر سے جنگل بن جائے گا اور گھاس پھونس کے علاوہ اس میں کچھ پیدا نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک غیر تہذیب یافتہ ملک

پر اچھی طرح سے حکومت کا انتظام چلانے اور اسے مکمل طور پر محکوم بنانے اور فتح کرنے سے قبل جنگ کے ذریعے اسے توڑ پھوڑ دینا چاہیے اور اسے مکمل فتح کرنے کے بعد اس پر اچھی طرح سے بیج نہ ڈالے جائیں اور حکومت کا انتظام صحیح طرز سے نہ چلایا جائے تو یہ جلد ہی پھر سے غیر تہذیب یافتہ بن جائے گا۔''(۴)

سچی بات تو یہ ہے کہ سامراج اور اس کے طور طریقوں کے اس اصولی طرزِ عمل میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مثلاً ہندوستان کی روایات پر حملے کا سرکاری طور پر اعلان ۱۸۱۲ء میں ولیم ولبر فورس (William Wilber Force) نے انگلستان کی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کیا جب اس نے کہا کہ ہندوستان کو ''تہذیب یافتہ'' بنانے کا موثر ترین ذریعہ یہ ہے کہ انگریز اس امر کو یقینی بنائیں کہ پورے ملک کے مذہب کو عیسائیت سے بدل دیا جائے۔ ہندو آبادی کو عیسائی بنانے کی کوشش اس کے منہ پر طمانچہ ثابت ہوئی اور سامراجی حکومت کی قابل نفرت ناکامیوں میں سے ایک ثابت ہوئی۔

تاہم ۱۸۲۵ء میں لارڈ بابنگٹن میکالے (Lord Babington Macaulay) کی جانب سے پیش کردہ ''سرکاری یادداشت'' کی شکل میں ایک بالکل نئی حکمت عملی وضع کی گئی جو جدید تعلیمی مہم کی بنیاد بن گئی اور نو آبادیاتی آقاؤں اور ان کے بعد آنے والوں کی توقعات سے کہیں بڑھ کر مفید ثابت ہوئی۔ اس انتہائی موثر یادداشت میں میکالے نے ہندوستان اور عربوں کے پورے عقلی اثاثے کو اپنے مشہور الفاظ میں یوں چت کر دیا:

''مجھے عربی یا سنسکرت کا کوئی علم نہیں ہے، لیکن میں نے وہ کیا ہے جو میں اپنی دانست میں ان کی اقدار کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے کر سکتا تھا۔ میں نے مشہور ترین عربی اور سنسکرت کتب کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے یہاں بھی (ہندوستان میں) اور اپنے ملک (انگلستان) میں بھی مشرقی زبانوں کے ماہرین کے ساتھ تبادلہ خیال کیا ہے۔ میں اس بات کے لیے بالکل تیار ہوں کہ مشرقی تعلیم کو خود مشرقی لوگوں کے ذریعے پرکھوں۔ مجھے ان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس بات سے انکار کر سکے کہ کسی اچھی یورپی لائبریری کی محض ایک شیلف، ہندوستان اور عربی کے پورے مقامی ادب پر بھاری ہے۔ مغربی ادب کی فطری برتری کو بلاشبہ وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو اس کمیٹی کے ممبر ہیں جو استشراقی تعلیم کے منصوبے کی حمایت کرتے ہیں۔''

میرا خیال ہے اس بات سے بمشکل ہی اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ ادب کا میدان جہاں مشرقی ادیب سب سے آگے ہیں، شاعری ہے۔ اور میں بالیقین یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں آج تک کسی ایسے

مشرقی آدمی سے نہیں ملا جس نے یہ کہنے کی جرات کی ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کا، عظیم یورپی قوموں کی شاعری سے موازانہ بھی کیا جاسکتا ہے لیکن جب ہم تخیلاتی ادب سے ان کتب کی طرف آتے ہیں جن میں حقائق بیان کیے گئے ہیں اور عام اصول وقوانین پر بحث کی گئی ہے، تو وہاں تو یورپیوں کی برتری کو کسی بھی پیمانے سے ناپا ہی نہیں جاسکتا۔ میرا یقین ہے کہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سنسکرت زبان میں لکھی گئی تمام کتب سے اخذ شدہ معلومات اس سے کہیں کم اہمیت رکھتی ہیں جو ہمیں انگلستان میں پڑھائی جانے والی ابتدائی جماعتوں کے حقیر ترین خلاصوں میں ملتی ہیں۔ طبعی اور اخلاقی فلسفے کے ہر شعبے میں دونوں قوموں کی قریب قریب یہی حالت ہے۔(۵)

میکالے نے اصرار کیا کہ ایک نیا نظام تعلیم رائج کیا جائے جس کے بہت واضح اہداف تھے:

''میرا خیال ہے کہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ، ہندوستان کی پوری آبادی کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرنا تو ناممکن ہے۔ اس وقت ہمیں اپنی پوری کوشش اس امر میں صرف کرنی چاہیے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان جن پر ہم حکومت کررہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے ذوق، رائے، اخلاقیات اور عقلیت میں انگریز ہوں۔''(٦) (بشکریہ مغرب اور اسلام) (جاری ہے)۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے

نام................................ پتہ................................

................................فون................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں

سیرۃ النبی　　　پروفیسر رشید احمد انگوی ☆

پیغمبرِ امن وسلامتی ﷺ

ذرا تصور تو کیجیے کہ روئے زمین کے عین وسط میں بگڑی ہوئی انسانیت نے کیا ادھم برپا کر رکھا تھا۔ ہر طرف جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ انسانی حقوق، شرفِ انسانی، بندگیٔ رب، احترامِ نسوانیت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اللہ کے گھر کو بتوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کے گرد عریاں طواف ہوتا تھا۔ غرض انسانیت اپنے زوال کی انتہائی پستیوں میں پڑی تھی۔ ایسے میں اللہ کی رحمت جلوہ گر ہوتی ہے اور جبل نور سے امن وسلامتی کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔ بقول مولانا ظفر علی خان:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

یا ایھا الناس اعبدوا اللہ (اے انسانو! اپنے رب کی بندگی اختیار کرو) کی جو دعوت ہر نبی نے اپنے زمانے اور اپنی قوم کے لوگوں تک پہنچائی، اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے بھی انسانوں کے سامنے پیش کی اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو خطاب کر کے بتایا کہ مجھے تمام انسانوں اور پوری نسلِ انسانی کی ہدایت کے لیے مامور فرمایا گیا ہے کہ میں حق کا پیغام پہنچاؤں، تمہیں ایمان کی طرف پکاروں اور اس پیغامِ ربانی کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ وخبردار کر دوں۔ ظلم، وحشت اور درندگی سے بھرے ہوئے ماحول میں پیغام امن وسلامتی کی کرنوں کا تصور تو کریں۔ کیا ہی نورانی تعلیم ہے جو آفتابِ نبوت کی کرنوں کی صورت میں انسانیت کو نصیب ہوئی جس میں عقائد کی اصلاح، دلوں کی پاکیزگی، علم کی روشنی اور حکمتِ نبوی کا عملی نمونہ شامل تھے۔ پوری انسانیت مل کر بھی پہلی وحی کی پانچ آیات پر مشتمل پیغام کا صحیح معنوں میں شکر ادا نہیں کر سکتی۔

سلامتی سے بھرا جامع فرمان الٰہی ہے: اقراء (پڑھو) بظاہر ایک لفظ ہے مگر اس میں علم وتحقیق کے کئی جہان آباد ہیں کہ قیامت تک زمانے آتے رہیں گے، نئے سے نئے مضمون آئیں گے، کتابیں آئیں

☆ پرنسپل (ر) گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، گوجرانوالہ

گی، مقالے آئیں گے، زبانیں آئیں گی، حروف والفاظ آئیں گے مگر تمہیں حکم ہے پڑھو یعنی پڑھو اور پڑھتے رہو، پڑھتے جاؤ۔ کبھی پڑھنے کا کام چھوڑ نہ دینا۔ مگر یہ پڑھنا اس وقت مبارک ہوگا جب تمہارے رب کے نام سے جڑا ہوا ہوگا۔ اس لیے یہ سب کائنات جس کے علوم تمہارے سامنے ہوں گے، بنائی ہوئی تو تمہارے رب کی ہے۔ بشمول تمہارے اپنے وجود کے جسے رحم مادر میں مختلف مراحل سے گزار کر بعد از پیدائش ذہنی، جسمانی، روحانی، ایمانی اور علم وعمل کے مراحل سے گزار کر تمہیں پڑھنے، غور وفکر کرنے اور لکھنے کے قابل بناتا ہے اور قلم کو تمہارے حصولِ علم اور تعلیم وتعلم کی صلاحیتوں سے مالا مال کرتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سوچیے اور بتایئے تو سہی کہ اگر انسان کو پڑھنا اور لکھنا نہ آتا تو آج اس کے دامن میں کیا ہوتا؟ کیا پڑھنے اور لکھنے کی جانب انسانیت کو پکارنے سے بڑھ کر بھی انسانی امن وسلامتی کے لیے کوئی تحفہ ہو سکتا ہے؟ یہی نہیں اس روشن پیغام سے شروع ہونے والی تیس پاروں پر مشتمل کتابِ ہدایت اور اسے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر عمل کر کے رول ماڈل پیش کرنے سے بڑھ کر انسان کو امن وسلامتی کے لیے دیا ہی کیا جا سکتا ہے؟ اصل میں انسانی امن وسلامتی کی یہی تو سب سے بڑی ضمانت ہے۔ آئیں اس موضوع پر خود کائنات بنانے اور چلانے والے رب العالمین کی اپنی زبان سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔

نبی پاک ﷺ کی تشریف آوری میں انسانیت کے لیے کتنی برکتیں، ہدایتیں اور رحمتیں پوشیدہ ہیں، اس سے ربّ کائنات ہمیں خود مطلع فرماتے ہیں۔ سورۃ یونس کی آیت ۵۷ میں تمام انسانوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت، دلوں کی بیماریوں کی شفاء اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت آ چکی ہے......اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ اپنے مالک کی جانب سے عطا کردہ نصیحتوں، ہدایتوں، رحمتوں اور ہر قسم کی شفا سے فیض یاب ہونے کی مقدور بھر کوشش کرے اور یہ اس قدر فرحت وسکون بخشنے والا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ تم پر اللہ کا وہ خاص فضل اور رحمت ہے کہ اس پر بہت خوش ہو جاؤ، اس نعمت کے مقابلے میں انسان کے جمع کردہ مال ودولت کے انبار کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔

سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۰۸ میں اس حقیقت کا اظہار واعلان ہوا کہ دینِ اسلام تو ہے ہی سراسر سلامتی کا راستہ وپیغام......قابلِ غور بات یہ ہے کہ انسان کے خالق ومالک سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ انسان کی سلامتی کس چیز سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اسلام کا قرار کرنے والوں کے لیے یہ فرمان جاری ہوتا ہے کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی سلامتی کے اس عقیدہ وعمل کو اپنا لو اور یاد رکھو کہ

تمہارا ازلی دشمن شیطان تمہیں سیدھے راستے سے ہٹا کر گمراہیوں میں مبتلا کرنے میں لگا رہتا ہے تو اس کی چالوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ مقامِ فکر ہے کہ جس دستورِ حیات کو خود رب العالمین سراپا سلامتی قرار دے اس سے بڑھ کر امن وسلامتی کا کوئی راستہ ہو ہی کیا سکتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۱۰۷ میں ان الفاظ میں بتایا گیا کہ اے میرے پیارے رسولؐ! ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور تمہارے ذریعے انسانیت کی رہنمائی بذریعہ وحی کا اہتمام فرمایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امن وسلامتی کے لیے جس تعلیم و ہدایت کی ضرورت ہے، اُسے طے کرنا انسان کے بس میں نہیں اس لیے آیاتِ الٰہی کی صورت میں انہیں راہ دکھائی جاتی ہے تا کہ انہیں حقائق کی بصیرت حاصل ہو سکے اور وہ حق و باطل نیز اچھائی اور برائی اور نفع ونقصان میں فرق کر سکیں۔ سورۃ لقمان جس میں ایک مردِ دانا کی زبان سے اپنے پیارے بیٹے کے لیے پند ونصائح پر مشتمل کلام نازل کیا گیا، اس کی ابتدائی آیات میں انسان کو آگاہ کر دیا گیا کہ یہ کتاب حکمت ودانائی کا خزانہ ہے اور جو لوگ اچھائی و بھلائی اور نیکی کی راہوں پر چلنے کے لیے تیار ہوں تو یہ آیات اللہ کی رحمت بن کر شاہراہِ حیات پر اُسے صحیح راستہ دکھاتی ہیں اور انسان کی امن وسلامتی کے لیے یہ کس قدر راہم نشان دہی ہے کہ تم حسنِ عمل اور حسنِ انجام کی راہ پر چل کر تو دیکھو، مالکِ کائنات تمہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں خود نورِ ہدایت عطا فرماتا جاتا ہے۔

قرآن نے قوموں وملکوں کی قیادتوں کے سامنے اپنے پسندیدہ اور کامیاب وکامران نمونے انبیاء کرام کی زندگیوں سے پیش کیے۔ اس کے لیے بادشاہوں اور حکمرانوں ذوالقرنین، حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت یوسفؑ اور خود رسول کریمؐ کا نمونہ پیش فرمایا۔ روزمرہ زندگی اور بالخصوص لمحۂ موجود کی شیطانی طاقتوں اور امن وسلامتی کے دشمنوں کی چالوں اور گمراہی کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے والے بندہ مومن کو یہ حوصلہ دیا جاتا ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار ہوں، تمہارے لیے تمہارے ربّ کا یہ حکم ہے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ (سورۃ الزمر: ۵۳) یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ یہ اس لیے کہ خواہ بظاہر پوری دنیا کی شیطانی مشینری انسان کو مایوسیوں کے اندھیروں میں دھکیلنا چاہتی ہو مگر ایمان و یقین کے راستے پر چلنے والے مسلمان کو اُس عزیز وحکیم ہستی کا سہارا جھکنے نہیں دیتا۔ البتہ یہ دنیا بھر کے علومِ نفسیات کے ماہر بھلا اس جیسی مضبوط نفسیات انسان کو دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ انسانی شخصیت کے عزم وحوصلہ کو امن وسلامتی کے اُس بلند مرتبے پر پہنچا دینے والا حیات آفرین پیغام ہے جس کا انسانی حکمت ودانائی کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔

سورۃ التوبہ آیت ۳۳ میں اعلان فرمایا کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اس لیے مبعوث فرمایا کہ حق کے راستے کو دوسرے تمام راستوں پر غالب فرما دے۔ یہ بذاتِ خود اس حقیقت کا بیان ہے کہ انسانیت کو حقیقی طور پر غالب ہونے کے لیے مقامِ رسالت اور پیغام رسالت پر ایمان لانے اور صدقِ دل سے اسے راہِ عمل بنا لینے سے ہی غلبہ نصیب ہوسکتا ہے۔ دینِ حق کا یہ غلبہ اصلاً انسانیت کے امن وسلامتی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ سورۃ الفتح آیت ۲۹ اس مضمون کی وضاحت یوں کرتی ہے کہ اہلِ ایمان آپس میں محبت، یک جہتی و اخوت کا طرزِ عمل اپنائیں اور دشمنانِ دین کے مقابلے میں باہم متحد ہوکر پوری شدت کے ساتھ میدانِ عمل میں ڈٹے رہیں تو کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اپنے اس احسان کا ذکر فرمایا کہ گمراہیوں میں ڈوبی انسانیت کو انبیاء و رسل اور آیات الٰہی کے ذریعے جہالت و جاہلیت سے نکال کر ایمان وہدایت کی روشنیوں کی طرف بلایا گیا۔ یعنی انسانی امن وسلامتی کا پہلا اور اہم ترین مرحلہ علم کی روشنی میں زندگی کی راہیں روشن کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانی امن وسلامتی اور ترقی کی ضمانت کیا ہوسکتی ہے۔ سورۃ الانفال آیت نمبر ۴۶ میں اہلِ ایمان کو باہم متحد رہنے کی ہدایت کی گئی اور گروہ بندی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوریوں سے بچنے کی راہ دکھائی گئی اور حالاتِ حاضرہ گواہ ہیں کہ باہم انتشار وتفرقہ میں مبتلا ہوکر اُن نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس سے بہت پہلے آگاہ وخبردار کردیا گیا تھا۔ کفر کی قوت کو توڑنے کے لیے جہاد اور بھرپور دفاع کی تعلیم دی گئی۔

آپؐ رسولِ رحمت ہیں۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ اور نورانیت سے مالا مال ارشاداتِ عالیہ انسانی زندگی کو کامیابیوں اور سرخروئی کی منزل کی جانب رواں دواں رکھنے کا مضبوط ترین ذریعہ ہیں۔ ذرا سیرت طیبہ کا اخلاق عالیہ کا باب سامنے رکھ کر دیکھیں تو سہی......نیکی، صلہ رحمی، اخوت، سچائی، خوش کلامی، نرم دلی، مہمان نوازی، شائستگی، تحمل، بردباری، صلح جوئی، ملنساری، رحم دلی، نرم مزاجی، وفاشعاری، پاک دامنی، فیاضی، انکساری، صبر وشکر، امن پسندی، عدل وانصاف، وسعتِ قلبی، اعلیٰ ظرفی، امانت ودیانت، شرم و حیاء، عفو درگزر، ایثار وقربانی، اعتدال پسندی، خودداری، شجاعت، ضبطِ نفس، توکل، یتیم پروری، قناعت، قول وفعل میں یک رنگی، دفاع بذریعہ جہاد وقتال، غرض ایسی صفاتِ عالیہ پر مبنی راہِ عمل کیا زمین پر چلتے پھرتے خاکی وجودوں کو فرشتوں سے برتر بنانے والا نصابِ حیات نہیں؟ یہ لائحہ عمل انسان کو امن وسلامتی کا چلتا پھرتا نمونہ بنا دینے والا ضابطہ حیات ہے۔ انسانیت محتاج ہے کہ اس تک یہ خوب صورت لائحہ عمل پہنچایا جائے۔ ان راہوں سے ہٹ کر اپنی پہچان بنانے والے عناصر، افراد یا گروہوں کے پاس معاشرے

کے امن وسلامتی کو تاراج کر کے اسے فساد سے بھر دینے والے طریقے ہیں جن سے اللہ کے رسولؐ نے ہمیں بچنے کی تلقین کی ہے۔آج انسانوں کی امن وسلامتی کو جو خطرات لاحق ہیں وہ سنتِ نبوی کو اپنانے اور فرقہ پرستی، شیطانی گروہ بندی اور باطل پسندی ترک کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔قرآن بتاتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَناتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی برائیوں کا توڑ ہی یہ ہے کہ اچھائیوں کا راستہ اپنایا جائے۔ ہر بدامنی اور انسانی سلامتی کو درپیش ہر خطرہ اسی بات کے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہے جس کی بنیاد عقیدہ توحید سے انحراف اور جھوٹ، باطل پروپیگنڈے، ظلم، تذلیل انسانیت، جبر وستم اور انصاف دشمنی کے سوا کچھ نہیں اور جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضور رحمت للعالمینؐ کی عطا کردہ تعلیمات وہدایات اور آپؐ کے اسوہ حسنہ کی قدم بہ قدم پیروی اور آپؐ کی ذاتِ پاک سے لازوال محبت، وفاداری اور جاں نثاری کا رویہ ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔

انسانی زندگی اور معاشروں کے امن وسکون کا تقاضا ہے کہ ہر انسان کے حقوق کی حفاظت ہو۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ سے بڑھ کر انسانی حقوق کی پاسداری ممکن ہی نہیں۔یتیموں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، بچوں کے حقوق، جوانوں کے حقوق، بوڑھوں کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، ہمسایوں کے حقوق، قرابت داروں کے حقوق، ضرورت مندوں اور سوالیوں کے حقوق، مسافروں کے حقوق، مہمان کے حقوق، بیماروں کے حقوق، جانوروں کے حقوق، حکمرانوں کے حقوق، شہریوں کے حقوق، طالب علموں کے حقوق، اساتذہ کے حقوق، طبیب کے حقوق، مریض کے حقوق، غرض ہر انسان کے حقوق کی تعلیم وتاکید اور حفاظت کی ضمانت تعلیمات نبوی سے بڑھ کر کہیں نہیں ملتی۔کیا معاشرے کے امن وسلامتی کے حوالے سے اس لائحہ عمل سے بہتر کوئی حل ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔دعا ہے کہ اللہ کریم ہمیں کتاب وسنت کی روشن ترین اور اعلیٰ وارفع تعلیمات کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے میں ماہر ہے لیکن نعمتوں کا حساب اکثر بھول جاتا ہے

اسلام اور مغربی فکر و تہذیب

محمد رشید☆

کیا مغربی فکروتہذیب سے استفادہ حرام ہے؟

مغربی جمہوریت کے بہت سے اصول مطابق اسلام ہیں تو انہیں اپنانے میں کیا حرج ہے؟

البرہان ستمبر اور اکتوبر 2014ء کی اشاعت میں مدیرالبرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب نے مسلمانوں کے لیے دنیا وآخرت میں کامیابی کے لیے کرنے کے اہم ترین کام کی طرف توجہ دلائی ہے اور قرآنی، اسلامی اور عقلی تناظر میں تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ صاحب مضمون نے بالکل درست تجزیہ کرتے ہوئے مغربی تہذیب کے فتنہ اور چیلنج کی طرف زوردار الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کو عصر حاضر میں اسلام کا سب سے بڑا حریف ثابت کیا ہے۔ انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں مغربی تہذیب کو دین غیر اللہ قرار دیتے ہوئے اسے رد کرنے پر زور دیا ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون میں ایک جگہ فرماتے ہیں ''شریعت/ دین اور تہذیب ایک ہی چیز ہیں'' ظاہری طور پر یہ بات غلط نہیں ہے۔ تاہم جب ذرا باریک بینی اور دقت نظر سے کام لیا جائے تو ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کو بھی اس بات سے اختلاف نہیں ہوگا کہ تہذیب بمعنی Culture کا منبع کئی متضاد و متنوع عقائد، افکار، رسومات، قوانین اور طریقہ ہائے رہن سہن ہو سکتے ہیں لیکن شریعت اور دین کا منبع صرف اور صرف وحی الٰہی اور سنت رسول ﷺ ہے۔ مزید برآں دین وشرع پر مبنی ایمانیات، عبادات، معاشرتی، معاشی اور سیاسی احکام، قوانین، منہیات، حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے تصورات کو بروئے کار لانے کے نتیجے میں اسلامی تہذیب جنم لیتی ہے۔ بالفاظ دیگر احکام الٰہی، سنت رسول ﷺ اور عقل وفکر کے نہایت معتدل، متوازن اور مخلصانہ امتزاج واشتراک عمل کے نتیجے میں اسلامی تہذیب نشوونما پاتی ہے۔ جس میں رضائے الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کو مرکزی ومحوری حیثیت حاصل ہے۔ دوسروں لفظوں میں اسلامی تہذیب کی جان، روح اور ڈھانچہ رضائے الٰہی (توحید واطیعوا اللہ) اور اتباع رسول ﷺ ہے۔ قرآن وسنت اسلامی معاشرے کو رضائے الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کا شوق، جذبہ اور قوت محرکہ دے کر افرادِ معاشرہ کا ایسا تزکیہ اور تہذیب کرتے ہیں اور ''تزکیہ وتہذیب'' کی ایسی خودکار چھلنی لگا دیتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے افراد سے ہر ہر برائی اور منکر جھڑ جھڑ کر جدا ہوتی چلی جاتی ہے اور دنیا میں موجود دیگر غیر مسلم اقوام ومعاشروں کی ہر اچھائی اور خوبی ''تزکیہ وتہذیب'' کی اس چھلنی سے چھن

☆ abu_munzir1999@yahoo.com

چھن کر اسلامی معاشرے میں داخل ہو کر اسلام کے رنگ میں رنگ کر اس کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔

افسوس صد افسوس مسلمانوں نے قرآن وسنت، رضائے الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کے عطا کردہ ''تزکیہ وتہذیب'' کے اس زبردست حیات آفریں اور بت شکن وابلیس کُش نظام کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا جس کے نتیجے میں قرآن وسنت کی عطا کردہ ہر خوبی ان میں سے نکلتی چلی گئی اور غیر مسلم معاشروں کی ہر خرابی کا وہ بآسانی شکار ہوتے چلے گئے۔

اس تناظر میں مغربی تہذیب کو رد کرنے کے معنی متعین کرنے کی از حد ضرورت ہے تاکہ اس ضمن میں مسلم معاشرہ افراط وتفریط کا شکار نہ ہو۔ مدیر محترم نے ہیومنزم، سیکولرازم، کیپٹلزم اور سائنٹزم پر اپنی بنیادیں استوار کرنے والی مغربی تہذیب کو بالکل درست طور پر دین غیر اللہ قرار دیا ہے۔ ہم اس پر صرف اتنا اضافہ کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ اردو زبان میں مغربی تہذیب کی درست ترین ترجمانی کرنے والی اگر کوئی اصطلاح ہوسکتی ہے تو وہ ''دجالی تہذیب'' ہے۔ مغربی تہذیب کی اٹھان اور تعمیر دھوکہ، فریب، چکر بازی، جھوٹ اور دجل پر ہے۔ بقول حکیم مشرق ''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں درس مساوات''۔ دجالی تہذیب یقیناً دین غیر اللہ کی بدترین اور مکروہ ترین شکل ہے کہ اس میں تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ جھوٹ، دھوکے اور فریب کا بدترین استعمال کیا گیا ہے۔

دجالی تہذیب میں انسانوں کے ''آزادی'' کے فطری جذبے کو ابھار کر اسے اللہ اور دین سے بغاوت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانی وقار، شرف اور حرمت کے جائز جذبہ کو بندگی رب سے فرار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاسی معاملات مشاورت، رائے عامہ اور پرامن طور پر چلانے کے مثبت جذبہ کو (''جمہوریت'' کے نام پر) اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت سے بغاوت کے لیے استعمال کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ ذاتی ملکیت اور کاروباری ومعاشی آزادی کے مثبت جذبہ کو اللہ کے بندوں کے بدترین استحصال اور معاشی وفکری غلامی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور انسانی ضرورتوں اور حاجات کی باسہولت تکمیل اور علاج، دفاع، رسل ورسائل اور مواصلات وغیرہ کے شعبوں میں انسانی معاشرہ کی خدمت کی غرض سے عقل وفکر کے حیرت انگیز استعمال کے مثبت جذبے کو اللہ اور اس کے دین سے بغاوت وسرکشی اور انسانیت کی روحانی موت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ صورتحال شدید تقاضا کرتی ہے کہ عالم اسلام میں دین کی خدمت کرنے والے گروہ اور جماعتیں مغربی تہذیب کی فتنہ گری اور اس کے طریق واردات کا فہم حاصل کریں۔ اسی کی طرف توجہ دلاتے ہیں ڈاکٹر امین صاحب نہایت دردمندانہ انداز میں لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے مسلم معاشروں میں مطالعہ مغرب کی روایت جڑ نہیں پکڑ سکی اور ہماری یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں اس کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں اور نہ ہمارے تحقیقی اداروں میں مغربی

علوم وسٹریٹیجیز کے تجزیہ وتحقیق کا کوئی اہتمام ہے............جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں ایک بھی 'مرکز برائے مطالعہ مغرب' موجود نہیں۔''

صاحب مضمون نے مغربی تہذیب کو ایک مستقل نظام حیات اور دین غیر اللہ قرار دیتے ہوئے اس کی بنیادی تفصیلات کی طرف توجہ دلا کر اسے رد کرنے پر زور دیا۔ اجمالی طور پر یہ موقف صدفی صد درست اور قابل تائید ہے۔ تاہم تفصیلات میں یہ موقف چند وضاحتوں کا متقاضی ہے۔ ہمارے جیسے نہایت عامی اور حقیر طالب علم کے ذہن میں درج ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب کو رد کرنے میں کیا یہ بھی شامل ہوگا کہ انسانی آزادی کے فطری جذبہ کا بھی انکار کر دیا جائے؟

۲۔ اس رد میں کیا یہ ماننا بھی ضروری ہوگا کہ باہمی مشاورت، رائے عامہ اور پرامن طریقہ سے سیاسی معاملات طے کیے جانے سے انکار کر دیا جائے؟

۳۔ ہیومنزم کے انکار میں کیا انسانی شرف، مجد اور تکریم کا بھی انکار کرنا شامل ہوگا یا نہیں؟

۴۔ سیکولرازم کا انکار کرتے ہوئے کیا اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق اور ان کی مذہبی آزادی کا انکار کرنا بھی ضروری ہوگا؟

۵۔ سائنٹزم کا رد اور انکار کرتے ہوئے کیا سرے سے ہی سائنس اور مفید سائنسی ایجادات کی تکفیر کرنا بھی ضروری ہوگا؟

۶۔ مختصر یہ کہ مغربی تہذیب کا رد کرتے ہوئے کیا مغرب کی ہر ہر جزئی اور فرعی چیز (چاہے وہ مثبت اور تعمیری ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اسلامی فکر سے اس کی تائید ہی کیوں نہ ہوتی ہو) کا رد کرنا بھی ضروری ہوگا۔

پاکستان میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی: محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ::

۱۔ مغربی جمہوریت اپنے ملحدانہ ورلڈ ویو کی وجہ سے اسلام مخالف ہے۔

۲۔ اسے نہ تو اسلامی قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے اور نہ اس سے نفاذ شریعت اور معاشرے و ریاست کی اسلامائزیشن کا کام لیا جا سکتا ہے۔

۳۔ مغرب کی لادین جمہوریت میں اسلامی اصولوں کی پیوند کاری سے اسے ''اسلامی جمہوریت'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ پاکستان میں مغربی اقدار کے غالب ہونے کی وجہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے۔

۵۔ دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی وجہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے۔

۶۔ مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جا سکتا لہٰذا اسے رد کر دینا چاہیے۔

محترم ڈاکٹر امین صاحب کے درج بالا موقف کے مطابق پاکستان کے فقہا وعلماء کرام نے بذریعہ اجتہاد جمہوریت کو اسلامی اصولوں سے جوڑ کر اسے قابل قبول بنانے کی راہ نکالی ہے۔ جبکہ ان کی رائے میں جمہوریت چونکہ اسلام مخالف ہے لہٰذا اسے ہر حال میں رد کر دینا چاہیے۔ چونکہ معاملہ رائے کا ہے اور محترم ڈاکٹر صاحب نے تاکید سے اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی ہے، لہٰذا یہ طالب علم اپنی حقیر اور طالب علمانہ رائے ذیل کی سطور میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔

جمہوریت کا ایک اعتقادی اور فکری پہلو ہے، یہ پہلو خفیہ اور چھپا ہوا ہے، جبکہ اس کا دوسرا پہلو ظاہری اور عملی ہے۔ اور یہ پہلو جمہوریت کی پہچان اور اس کا Face introduction ہے۔ جمہوریت کے خفیہ اعتقادی پہلو کو محترم ڈاکٹر صاحب نے بالکل درست الفاظ میں ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' پر مبنی قرار دیا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جمہوریت کے ظاہری عملی پہلو پر کوئی گفتگو نہیں فرمائی۔ مثلاً (۱) حق حکومت اور تبدیلی حکمران بذریعہ انتخاب ،اہل حل وعقد کی مشاورت اور وسیع تر عوامی رائے، اور پُر امن انتقال اقتدار (۲) حکومت کا فرد کی آزادیوں پر قدغنیں لگانے سے اجتناب کرنا، (۳) رائے کی آزادی کا احترام، (۴) حکومت اور حکمرانوں پر بلا خوف وخطر تنقید کا حق (۵) حکومت کے غلط کاموں کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرانے کا حق (۶) (مقاصد شریعت کے طور پر بیان ہونے والے) بنیادی حقوق یعنی دین، جان، مال، آبرو وغیرہ کی حفاظت کا حق (۷) مکمل قانونی مساوات (۸) رفاہ عامہ اور (۹) کفالت عامہ (۱۰) تعلیم سب کے لیے وغیرہ وغیرہ یہ اسلام کے عطا کردہ سیاسی نظام ''خلافت'' کی وہ برکات واقدار ہیں جنہیں دنیا آج مسلمانوں کی بدترین غفلت، سستی، کوتاہی، دین سے دوری اور بے وفائی کے نتیجہ میں جمہوریت کی Face Values کے طور پر پہچانتی ہے۔

ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کے اربوں لوگ خاص طور پر اہل اسلام جمہوریت کو اس کے خفیہ اعتقادی پہلو کی وجہ سے نہیں پہچانتے بلکہ اس کے مذکورہ بالا ظاہری عملی پہلو (Face introduction) کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ مغرب کے ابلیس اور دجال جانتے تھے کہ مغرب کا انسان مسخ شدہ مذاہب خصوصاً مسیحیت اور کلیسا کے جبر، غیر عقلی اور گنجلک عقائد سے نالاں ہے۔ ان حالات میں اسلامی خلافت کی مذکورہ بالا برکات اگر مغرب کے انسان تک اسلام کے تعارف کے ساتھ پہنچ گئیں تو عالم مغرب میں مسیحیت کے خلاف بغاوت ہو جائے گی اور مغرب کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی۔ یہ وہ خوف اور خطرہ تھا جس کا انسداد ضروری سمجھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں مغرب کے انسانوں کی اکثریت عیسائیت کے متضاد عقائد کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک چکی تھی اور وہ اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی، ان حالات میں اگر اسلامی خلافت کی برکات اصل اسلامی عقائد وایمانیات اور خالص اسلامی تناظر میں مغرب کے انسان تک پہنچ جاتیں تو عالم مغرب کی اکثریت اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لے لیتی۔ مغرب کے ابلیسوں اور دجالوں

کو مغرب کے انسانوں کو بذریعہ کلیسا اپنا غلام رکھنا اور ان کا استحصال جاری رکھنا اب زیادہ دیر تک چلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا چنانچہ اس خطرے کا انسداد اس طرح کیا گیا کہ ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' وغیرہ نظریات کے لیے زمین ہموار کی گئی۔لیکن مشکل یہ تھی کہ عالم مغرب سے ان غیر فطری نظریات کو قبول کیسے کرایا جائے؟ کیونکہ چند لوگوں کو تو شاید ان غیر فطری نظریات کا حامی بآسانی بنایا جاسکتا تھا مگر اس کی عظیم قبولیت کے لیے ابلیس کو اپنی ازلی مکاری، فریب، جھوٹ اور دجل سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ اسلامی خلافت کی دنیاوی برکات اور اصولوں کو چن چن کر ایک پیکج تیار کیا گیا اور اس پیکج کا نام ''جمہوریت'' رکھا گیا۔اور بڑے شدومد اور زور شور سے یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ ''جمہوریت'' کے اس پیکج سے صرف اسی صورت استفادہ ممکن ہے جب ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' کی بنیاد پر مذہب کا انکار اور اس سے آزادی حاصل نہ کرلی جائے۔عالم مغرب ابلیس کے اس دجل اور فریب میں بآسانی آ گیا۔سوال کیا جاسکتا ہے کیوں؟ کیونکہ وہ مسیحیت اور کلیسا کے غیر فطری اور باہم متضاد نظریات کا بوجھ (جس نے ان کی دنیا اور امن بھی برباد کر کے رکھا ہوا تھا) اٹھا اٹھا کر تھک چکے تھے اور وہ اس بوجھ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔افسوس یہ عین وہی وقت تھا جب مسلمانوں کی اجتماعیت داخلی زوال، ایمانی و دینی بحران اور بدترین باہمی چپقلش کا شکار ہو چکی تھی۔مخلص مسلم مصلحین اور داعیین کی تمام تر توجہ امت کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اس داخلی زوال اور بحران پر قابو پانے پر لگی ہوئی تھی کہ عین اسی لمحے ابلیس عالم مغرب میں اپنا کام کر گیا اور امن و آزادی کا لالچ دے کر ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' قسم کے غیر فطری عقائد و نظریات کے شکنجہ میں عالم مغرب کو جکڑ لیا۔

ابلیس نے انسانیت کو دھوکہ دیا۔عالم مغرب کے ابلیسی کارندوں نے اسلام سے نفرت اور ظلم، استحصال، بے رحمی، فساد اور خون خواری کا رسیا ہونے کی بنا پر انسانیت کو ''کلیسا کے جبر'' سے نکال کر جمہوریت کے عنوان سے ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' قسم کی ملحدانہ اور جابرانہ سوچ کے شکنجے میں پھنسا کر رکھ دیا۔اور عالم مغرب کا انسان یہ سمجھتا رہا کہ وہ امن، آزادی، احترام انسانیت، (۲) حکومت کا فرد کی آزادیوں پر قدغنیں لگانے سے اجتناب (۳) رائے کی آزادی کا احترام، (۴) حکومت اور حکمرانوں پر بلاخوف وخطر تنقید کا حق (۵) حکومت کے غلط کاموں کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرانے کا حق (۶) بنیادی حقوق یعنی دین، جان، مال، آبرو وغیرہ کی حفاظت کا حق (۷) مکمل قانونی مساوات (۸) رفاہ عامہ اور (۹) کفالت عامہ (۱۰) تعلیم سب کے لیے اور حکومت و حکمران کے پُر امن چناؤ اور انتخاب کے حق کی شاہراہ پر چل نکلا ہے۔کیونکہ ابلیسی اور دجالی کارندوں نے مذکورہ بالا آزادیوں (حقوق) کی پہچان جمہوریت کی عملی اقدار اور Face Values کے طور پر کرائی تھی۔

ابلیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اسلامی خلافت کی برکات کا سرقہ کرتے ہوئے ان کو

جمہوریت کی Face Values کا ''چولا'' پہنا دیا، اور انسانیت کو بدترین الحاد اور ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' اور دیگر غیر فطری اعمال ونظریات کا غلام بنالیا۔ اور اپنے اس تمام مکر، فریب اور دجالیت کا نام اس نے ''جمہوریت'' رکھا۔ لیکن ٹھہریے یہ تصویر کا ایک پہلو ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عالم اسلام پچھلے پانچ سو سال سے ایک نہ ختم ہونے والے زوال اور بحرانوں سے دوچار ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے ایسے وقت میں جب عالم اسلام متاع دین کے معاملے میں بدترین غفلت، جہالت اور معصیت میں ڈوبا ہوا تھا، اس کا واسطہ مغرب سے آنے والی ''جمہوریت'' سے پڑا۔ دین سے غافل اور تہہ در تہہ روحانی و مادی بحرانوں کا شکار ہونے کی وجہ سے عالم اسلام کی اکثریت خلافت اور اس کی برکات سے تو مدتوں سے بے بہرہ اور ناواقف ہو چکی تھی۔ ایسے حالات میں جب اس کا واسطہ جمہوریت کی نیلم پری سے پڑا تو یہ ایک نہایت فطری ردعمل تھا کہ عالم اسلام کی اکثریت نے جمہوریت کو اس کی Face Values کی بنا پر تحسین کی نظروں سے دیکھا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے فقہاء اور اہل علم حضرات نے ''جمہوریت'' کو اس کے مخفی عقائد سے الگ کرتے ہوئے اور ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' کی بجائے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان، اسلامی عبادات، اسلامی معاشرت اور اسلامی معیشت کا کلمہ جمہوریت کو پڑھواتے ہوئے اس کی Face Values کی بنا پر اسے ''اسلامی جمہوریت'' کا نام دے دیا۔ حالانکہ اس نئی صورت میں اس کا اصل اور قدیمی نام ''اسلامی خلافت'' تھا۔

اس تناظر میں جمہوریت کو اس کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' سے کاٹ کر اسلامی عقائد، عبادات، معیشت، معاشرت اور قوانین کو اس میں داخل کر دینا فروعی اور جزئی قسم کی تبدیلی نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں جمہوریت کو اس کے مخفی عقائد سے کاٹ کر اس میں اسلامی عقائد و عبادات ڈال دینا، یہ محض جمہوریت کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پیوند کاری کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت جمہوریت کو اسلام کا کلمہ پڑھوانے کا معاملہ ہے۔ یہ جمہوریت میں ایک جوہری اور بنیادی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ چنانچہ وہ جمہوریت جو اپنے ''ملحدانہ ورلڈ ویو'' کی وجہ سے اسلام مخالف تھی، اس سے جب اس ملحدانہ ورلڈ ویو ہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا جائے تو ''اسلام سے اس کی مخالفت'' کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس تجزیہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ بیان کہ'' پاکستان میں مغربی اقدار کے غالب ہونے کی وجہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے۔'' حقائق پر مبنی نہ ہے۔ ہمارا یہ تجزیہ نتیجہ کے اعتبار سے اس بیان کی بھی نفی کر رہا ہے کہ ''دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی اصل وجہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے۔''

ہماری طالب علمانہ رائے میں جو اہل علم دلائل کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں کہ ''مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا اسے رد کر دینا چاہیے۔'' رائے کی آزادی کے اصول کے تحت ان

کے موقف کا احترام کیا جانا چاہیے، تاہم دعوتی نقطہ نظر سے ہم اس رویہ کو خلاف حکمت سمجھتے ہیں۔ ہماری عاجزانہ رائے میں یہ ایک نہایت سادہ، زیادہ درست اور نسبتاً واضح موقف ہے کہ جمہوریت کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' کا انکار کر دیا جائے اور ان ملحدانہ افکار کی بجائے اسلامی ایمانیات وعبادات کی روح کے اقرار کے ساتھ جمہوریت کی Face Vlues کی وجہ سے اس کے نام کو باقی رہنے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ ہم دوبارہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس صورتحال میں اس رویہ کا اصل نام ''خلافت'' ہے۔ تاہم اگر ''**کلموا الناس علی درج عقولھم**'' (لوگوں سے ان کی عقلی سطح کے قریب رہ کر بات کرو) کے اصول کے تحت دعوتی مصلحت یا حکمت کی بنا پر اس رویہ کو ''اسلامی جمہوریت'' سے تعبیر کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ جمہوریت اور الحاد کو لازم وملزوم قرار دینے والے محترم اہل علم کے دلائل ہمیں آج تک متاثر نہیں کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں ان محترم اہل علم کی کوئی بھی دلیل ہم جیسے نہایت ادنیٰ طالب علموں کو اس بات پر قائل نہیں کر سکی کہ جمہوریت کو اس کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم'' سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس وہ اہل علم جنہوں نے جمہوریت کو اس کے ملحدانہ مخفی عقائد سے الگ کر کے اسلامی فکر کی تابعداری اختیار کرنے کی صورت میں اس کے جواز کی راہ نکالی ہے ان کا طرز عمل قابل فہم، صائب اور زیادہ مدلل ہے۔ جمہوریت سے اس کے ملحدانہ عقائد کو کاٹ پرے پھینکنے کی کاوش اور اسلامی عقائد ونظریات کی فرمانروائی اسے قبول کروانا اور جمہوریت کی Face Values (جو کہ اصلاً اسلامی خلافت کی عطا ہیں) کی تصویب وتائید کرنا زیادہ صائب طرز عمل ہے۔ یہ ایک اچھی ابتداء تھی پاکستان میں جس کا آغاز آج سے کم وبیش نصف صدی قبل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ ہم اہلیان پاکستان اسلامی جمہوریت (خلافت) کا ایک ایسا تابندہ اور زندہ نمونہ عالم انسانیت کو پیش کرتے جو مغربی جمہوریت کی فریب کاریوں، حرام کاریوں، جھوٹ، دھوکے، استحصال، مادیت پرستی، سرمایہ داریت، دولت کی پرستش اور رسہ گیری سے پاک ہوتی۔ ہم دنیا میں اسلامی جمہوریت کا ایک ایسا ماڈل پیش کرتے جو رائے عامہ کو منفی، ذلیل اور پست ہتھکنڈوں کے ذریعے خود فراموش وخدا فراموش بنانے کی خباثتوں سے پاک ہوتا، جو حرام خوروں، انسانیت دشمنوں اور دولت کے پجاریوں کو عوام کی قسمت اور ناگزیر منزل سمجھانے کی لعنتوں سے پاک ہوتا۔ فلاحی حکومت کا ایک ایسا ماڈل جو فلاح عامہ، خدمت خلق، امن وانصاف اور انسانی حریت وآزادی کی سچی اور پاکیزہ تصویر عالم انسانیت کو عملاً پیش کرتا۔ لیکن افسوس صد افسوس اس سمت ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکے۔ ہماری سیاسی ودینی جماعتوں کے لیے نہایت شرم کا مقام ہے کہ کم وبیش پچاس سالوں سے وہ اوپر بیان کی گئی اچھی ابتداء سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس کے برعکس اسلام کی

چند ظاہری مردہ رسومات، بے روح اعمال اور خشوع سے خالی رویوں کے ساتھ ہماری دینی و مذہبی سیاسی جماعتیں دن بدن ترقی کرتی چلی گئیں۔ مذہبی قیادت اور کارکن مغربی جمہوریت کی پہچان سمجھی جانے والی لعنتوں، نحوستوں، عوام الناس کی بدترین تذلیل اور حقوق العباد کو روندنے کے منفی ہتھکنڈوں اور دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ اسلامی سپرٹ، تقویٰ و تدین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اعلیٰ ایمانی اور اخلاقی رویوں اور عدل وانصاف کا مظاہرہ ڈھونڈے سے بھی ان کے اعمال و کردار میں نہیں ملتا۔ اس کے برعکس علو و تکبر، من دیگرم تو دیگری، جماعتی و گروہی تعصّبات، وقتی و ہنگامی معاملات و مسائل میں اپنی صلاحیتوں کو گم کردینا اور محض لفظ اسلام یا اسلامی انقلاب کا ڈھنڈورا پیٹتے رہنا ان کا طرۂ امتیاز اور پہچان بنتی چلی گئی۔ دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی اصل وجہ وہ خود، ان کے رویے، ان کا کردار اور اسلام و انسانیت (حقوق اللہ وحقوق العباد) سے ان کی غافلانہ روش اور رویے ہیں۔ خارج میں تو ابلیس اور شیطان ہمہ وقت سازشوں اور وسوسہ انگیزیوں میں مصروف کار رہے، نجات اور کامیابی کا حقدار تو وہ ہوگا جو ان خارجی وسوسہ انگیزیوں کا شکار ہونے کی بجائے مشکلات اور رکاوٹوں میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے (تقویٰ) اسلام کی پیروی اور اشاعت و ترویج کا فریضہ ادا کرتا چلا جائے۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کے اس موقف، کہ ''مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جاسکتا۔ لہٰذا اسے رد کردینا چاہیے۔'' کے صرف اسی جزو کو درست تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جمہوریت کے مخفی عقائد ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' سراسر الحاد اور اسلام مخالف ہیں لہٰذا ان کو رد کردینا چاہیے۔ تاہم اس رد اور انکار کی ہر وہ صورت غلو اور شدت پر مبنی ہوگی جو اس جوشِ تردید میں جمہوریت کی Face Values (جن میں سے اکثر و بیشتر اسلامی خلافت کی عطا ہیں) ہی کا انکار کردیا جائے۔ ایسا ہر انکار قابل مذمت سمجھا جائے گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ عیسائیت کی تثلیث اور الوہیت مسیح کے رد اور انکار کے جوش میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) ہی کا انکار کردیا جائے۔

تاہم اس کے باوجود ڈاکٹر محمد امین صاحب اور دیگر اہل علم جو اس بات کا شدومد سے اظہار فرماتے ہیں کہ ''مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جاسکتا۔ لہٰذا اسے رد کردینا چاہیے''۔ ہمارا نہایت طالب علمانہ اور عاجزانہ استدعا ہے کہ وہ جتنا زور اور شدت مغربی جمہوریت کی تردید اور انکار پر صرف فرماتے ہیں کم و بیش اتنا ہی زور اور شدت اسلامی خلافت کی ان برکات و ثمرات کے اثبات اور تعارف پر بھی صرف فرمائیں، جن کا سرقہ کرکے اہل مغرب کے ابلیس جمہوریت کی face values کے طور پر انہیں متعارف کرواتے ہیں۔ تاہم بے حد افسوس کا مقام ہے کہ بعض اہل علم حضرات (ڈاکٹر محمد امین صاحب کے علاوہ) جمہوریت کے انکار کے جوش میں اس کی face values کا بھی نہایت شدومد سے انکار اور استہزا پر صلاحیتوں کو برباد کرتے پائے جاتے ہیں، حالانکہ

جمہوریت کی یہ face values جن کی تفصیل اس مضمون کے شروع میں بیان کی گئی ہے، انسانیت کی مشترک متاع ہیں اور درحقیقت ان اقدار و برکات کو اپنے نمود و اظہار کا اعلیٰ ترین موقع اور موافق ترین ماحول اسلام کے دورِ خلافت میں میسر ہوا۔

راقم کی یہ بھی طالب علمانہ رائے ہے کہ مغرب کے ابلیسوں نے اپنے دجل اور فریب کے زور پر ''جمہوریت'' کا فتنہ ایجاد کیا کہ انسان کو امن، آزادی، احترام اور بنیادی حقوق (جمہوریت کی face values) کا لالچ و طمع دے کر ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' (جمہوریت کے مخفی عقائد) کے الحاد میں اس کے ذہن وروح کو گرفتار کرلیا جائے تاکہ عالم مغرب کو اسلام سے دور رکھا جاسکے۔ لیکن عالم اسلام عمومی طور پر اس فتنہ کا توڑ کرنے میں ناکام رہا۔ دوسرے لفظوں میں مغرب کے ابلیسی ذہن نے اپنے دجالی منصوبے کے تحت عالم مغرب کو اسلام سے دور اور محروم رکھنے کے لیے جس ہتھیار (جمہوریت) کا استعمال نہایت کامیابی سے کیا، عالم اسلام اگر مومنانہ فراست اور زادِ تقویٰ کے شدید افلاس میں مبتلا نہ ہوتا تو مغرب کے اسی ہتھیار (جمہوریت) کو ان پر الٹ سکتا تھا اور اسی ہتھیار سے ان کے ملحدانہ افکار کے دجل، فریب اور جھوٹ کو طشت از بام کر کے اسے اسلام کی عالمگیر دعوت کے لیے استعمال کرسکتا تھا، مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا۔

جس کی قابل عمل صورت یہ ہوسکتی تھی کہ جمہوریت کی face values کو اسلامی خلافت کے تعارف اور پہچان کے لیے استعمال کیا جاتا اور اس کے ساتھ اسلام کی زوردار اور جاندار دعوت و اشاعت کا فریضہ سرانجام دیا جاتا۔ مگر افسوس 21ویں صدی کے مسلم سیاستدان، مسلم مفکرین، مسلم اہل علم اور مسلم دانشوروں میں سے کوئی بھی یہ فرض کفایہ ادا کرتا نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس جمہوریت کے انکار کے جوش میں بعض اہل علم نے جمہوریت کی ان face values ہی کا انکار کرڈالا اور اس طرح اسلام کا مقدمہ خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ گویا عالم مغرب کے ابلیسوں نے جس ہتھیار (جمہوریت) کو اسلام کے خلاف استعمال کرنے کی اسکیم بنائی، عالم اسلام کے اہل علم بجائے اس کے کہ عالم مغرب کی اس اسکیم کو الٹ دیتے اور انہی کا ہتھیار (جمہوریت) انہی کی دجالی تہذیب کے فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے استعمال کرتے، الٹا اس اسکیم کے شریک کار بن گئے اور جمہوریت کی face values کے انکار کے ذریعہ سے عالم مغرب میں اسلام کی نہایت حسین اور خوبصورت شکل کو بگاڑنے کی اسکیم کا غیر شعوری طور پر حصہ بن گئے۔

اسلامی جماعتوں کی ناکامی کی اصل وجہ؟ اس مقام پر ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی جماعتوں کی ناکامی کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے جمہوریت کو اسلامیانے کی کوشش کی۔ ہم نے یہ کوشش ضرور کی

مگر ہماری یہ کوشش ناتمام رہی۔اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو یہ ایک بہت بڑا اجتہادی کارنامہ ہوتا لیکن افسوس ہم ایسا نہیں کرسکے۔ایسا کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود عالم اسلام کا فکری وایمانی ضعف کے نتیجے میں ترجیحات(priorities) کا واضح فقدان تھا۔جب ہماری دینی وسیاسی جماعتیں ''ایمان،تقویٰ،عبادات،حلال وحرام،حقوق اللہ وحقوق العباد اور آخرت کے نصب العین'' کے معاملے میں بدترین بحران،زوال اور غفلت میں مبتلا ہوں اور قرآن وسنت کی پیروی ان کی ترجیح اول نہ رہی ہو تو دشمن کے کسی فکری حملہ اور اسلام کش اسکیم کا رد کرنا اور جواب دینا تو بڑی دور کی بات ہے،خود اسلامی تعلیمات اور احکام کی بجا آوری میں توازن اور درست ترجیحات قائم رکھنے میں ہی وہ بری طرح ناکام ہوجاتے ہیں۔اس تناظر میں اہل اسلام کی ناکامی کی اصل وجہ کسی خارجی عنصر یا فکر سے ان کا تعامل(interaction) نہیں ہوتا بلکہ ناکامی کی اصل وجہ اہل اسلام خود ہوتے ہیں اور اسلام کے ساتھ ان کا غیر سنجیدہ رویہ ہوتا ہے۔ایمان،عبادات،تقویٰ،حلال وحرام،حقوق اللہ وحقوق العباد اور آخرت کے نصب العین اور قرآن وسنت کے اتباع سے غفلت وہ سنگین ترین اسباب وعوامل ہیں جو اہل اسلام کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت کردیتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ ہمارے دینی قائدین کی وابستگی اور غیر سنجیدہ رویہ کا حال یہ ہے کہ ایک نظریاتی دینی سیاسی جماعت کے امیر ایک دن بیان جاری فرماتے ہیں کہ ''اس ملک کا مستقبل جمہوریت سے وابستہ ہے''۔اگلے دن بیان دیتے ہیں کہ ''پارلیمنٹ میں چور اور ڈاکو بیٹھے ہیں''۔اس کے اگلے دن ارشاد ہوتا ہے کہ ''پارلیمنٹ کو آئینی مدت پوری کرنی چاہیے''۔جبکہ دوسری چوٹی کی مذہبی سیاسی جماعت کے امیر بیان جاری فرماتے ہیں کہ ''ہم نے ہمیشہ جمہوری اصولوں کی پاسداری کی ہے''۔اور یہ کہ ''ہر حال میں جمہوریت کا دفاع کریں گے''۔اسی تسلسل میں بیان بازی ہوتی ہے کہ ''تمام مسائل کا حل جمہوریت اور پارلیمنٹ ہے''۔لیجیے بتایئے کہاں گیا اسلام،اسلامی اقدار،اسلامی احکام اور بیچاری اسلامی جمہوریت؟ ہمارے دینی ومذہبی قائدین تو کھل کر اور واضح لفظوں میں چوروں اور ڈاکوؤں والی اور ملی مفادات پر ذاتی وگروہی مفادات کو ترجیح دینی والی پارلیمنٹ اور جمہوریت کے حامی،محافظ اور علمبردار بن چکے ہیں۔اسلام کا نام صرف برکت کے لیے اور دکھاوے کی حد تک رہ گیا ہے۔ورنہ مذہبی قائدین کی ترجیحات بھی کم وبیش وہی بن چکی ہیں جو کہ عام سیاسی قائدین کا طرۂ امتیاز ہے۔یہ جمہوریت کا وہ ہیضہ ہے جس میں مذہبی وغیر مذہبی تمام قائدین بری طرح مبتلا ہوچکے ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ (قرآنی واسلامی اصولوں پر مبنی) اعلیٰ سے اعلیٰ (روحانی) غذا اور انسانی قدر ان کے معدہ (باطن) میں انڈیلی جاتی ہے تو جواباً (بدبودار اور گھٹیا ہتھکنڈوں،گروہی ولسانی اور جماعتی تعصّبات اور مادی ترغیبات پر مبنی) جمہوریت کا گند ان کے اندر سے برآمد ہوتا ہے۔دوسری طرف جمہوری ہیضے کے اس مرض،سڑاند

اور بدبو سے بیزار اور متنفر ہوکر بعض اہل علم ردعمل میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ وہ جمہوریت کی بعض نمائندہ ترین قدروں(face values) مثلاً آزادی اور بنیادی حقوق ہی کا انکار کرنے اور اس کا استہزا اڑانے کو اسلامی خدمت کا عنوان دے دیتے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت کے ہیضہ اور اس کی گندگی سے متنفر ہمارے بعض نہایت محترم اہل علم جمہوریت کی نمایاں ترین قدر''آزادی'' کو اسلام کے تصورعبدیت کی ضد قرار دے کر اسے مسترد کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کا تصور عبدیت انسان کی سچی آزادی کا اعلیٰ ترین، حسین ترین اور محفوظ ترین منہاج ہے۔ ایک اللہ کی بندگی انسان کو ہزاروں خداؤں کی بندگی سے آزاد کردیتی ہے، انسان کو بادشاہوں کے ظلم، کلیسا کے جبر، عیسائیت کی تثلیث، رہبانیت اور سوچ وفکر کی بدترین غلامی سے صرف اور صرف اسلام ہی تو آزاد کراتا ہے۔ کلیسا نے خدائی اختیارات استعمال کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے جس طرح انسانیت، خاص طور پر عالم مغرب کو اپنی بدترین غلامی میں جکڑا ہوا تھا، اس سے آزادی صرف اور صرف اسلام دلاسکتا تھا۔ لیکن افسوس مغرب کے ابلیسی آلہ کاروں نے بروقت تدارک کرتے ہوئے اور عالم مغرب کو اسلام کی عطا کردہ سچی آزادی سے محروم رکھنے کے لیے ''جمہوریت'' کا کھلونا ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اور انسانیت کم وبیش اگلے چار سو سالوں تک ''جمہوریت'' کے اس کھلونے کے سحر میں گرفتار ہوکر اپنی آزادی مغرب کے انسانیت دشمن ساہوکاروں کے ہاتھوں انتہائی پست قیمت پر بیچتی چلی آرہی ہے، اپنے ذہن، جسم اور اپنی روح کو''ہیومنزم، سیکولرازم، کیپٹلزم اور سائنٹسزم'' کی بدترین قید میں دینے پر بخوشی راضی ہوگئی اور گزشتہ چار سو سالوں سے اپنی آزادی کا قتل''آزادی'' ہی کے نام پر کرتی چلی آرہی ہے۔

اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارے دینی سیاسی قائدین جمہوریت کو اسلام کے تناظر میں پرکھنے اور برتنے کی بجائے اسلام کو جمہوریت کے تناظر میں برت رہے ہیں۔ مطلوب تو یہ تھا کہ بشمول دیگر شعبہ ہائے حیات سیاسی میدان میں بھی اسلام اصل ہوتا اور جمہوریت کو محض آلہ کار کے طور پر برتا جاتا۔ مگر یہاں تو ترتیب ہی الٹ چکی ہے اور جمہوریت کو اصل کا مقام حاصل ہو چکا ہے اور اسلام کو عملاً محض ایک آلہ کار کے طور پر برتا جارہا ہے۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اورسائنٹسزم'' کے اسلام مخالف نظریات کی حامل جمہوریت کو برتنے کا نتیجہ نہیں ہے؟ اس سوال کا نہایت سادہ سا جواب یہ ہے کہ جب ہماری دینی و مذہبی جماعتوں کی قیادت قرآن وسنت کے اتباع نیز ایمان، تقویٰ، عبادات، حلال وحرام اور حقوق اللہ وحقوق العباد اور آخرت کے نصب العین سے انمٹ وابستگی اور وفاداری کے معاملے میں کند ذہنی اور کوڑھ مغزی کا شکار ہوچکی ہو تو پھر ناکامی کو کسی خارجی چیز میں تلاش کرنا ایک مہمل اور لایعنی طرز عمل ہے۔ خارجی رکاوٹ تو اس وقت زیر بحث آئے گی جب آپ داخلی رکاوٹوں کے تمام حصار عبور کر چکے ہوں جبکہ موجودہ صورتحال میں تو ہماری قیادت داخلی رکاوٹوں کے بالکل ابتدائی زینوں پر ہی چاروں شانے چت ہوکر گر چکی ہے۔ ہماری قیادت کی فکری عدم یکسوئی،

نظریاتی کھوٹ، اخلاقی اور عملی زوال نے انہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ اہل اسلام کو درپیش کسی فتنہ اور چیلنج کا مقابلہ تو کیا کرتے خود اسلام کی پیروی اور اسلام کی دعوت واشاعت کے معاملے میں ہی وہ بانجھ اور اہلیت سے عاری ثابت ہو چکے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ ہماری طالب علمانہ رائے میں ہر اس سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملے کی اسلام کاری کرنا ایک مستحسن اور مطلوب عمل ہے، جس کی قرآن وسنت کی نصوص میں واضح حرمت اور ممانعت بیان نہ کی گئی ہو۔ خاص طور پر غیر اسلامی معاشروں اور غیر مسلم اقوام کے ایسے معاملات جن کی بعض یا اکثر جزیات اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں، ایسے معاملات میں سے اسلام مخالف عناصر وجزیات کو نکال باہر پھینکنا اور اسلام سے ہم آہنگ جزیات کو باقی رکھتے ہوئے اس کو مفاد عامہ کے لیے اختیار کرنا اور استعمال کرنا ایک مستحسن اور مطلوب طرز عمل ہے۔ ہم جمہوریت کو بھی اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری طالب علمانہ رائے میں مغرب کے دجالوں نے عالم مغرب کو اسلام سے روکنے اور دور رکھنے کے لیے ''جمہوریت'' کا سیاسی ہتھکنڈا ایجاد کیا، لیکن اس میں انسانی آزادیوں، انسانی حقوق، امن اور احترام انسانیت کے ایسے عناصر واجزا پائے جاتے ہیں جن کی اسلام نہایت شدومد سے تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن اقدار کو جمہوریت میں محض دکھاوے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، عملاً ان سے بھی انسانیت کشی (مذہب بیزاری، روحانی تقاضوں کو روندنے، دولت کی ہوس، بدترین سرمایہ داری کی پرستش، سود کے بدترین استحصالی پھندے میں پھنسنے، روح وجسم اور آبرو کے تحفظ کو مشکل سے مشکل تر کر دینا، بے حیائی، زنا اور حرامکاری کے فروغ) کا ہی کام لیا جاتا ہے جبکہ اسلام ان اقدار سے انسانیت کشی کی بجائے انسانیت کے دفاع، تحفظ اور فلاح کا کام لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام جمہوریت کی face values سمجھی جانے والی اقدار کا اصل محافظ اور علمبردار ہے۔ لہٰذا ان عناصر وجزیات کی بنا پر جمہوریت کی اسلام کاری کرنا اور اس میں زبردستی داخل کیے گئے ''ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم'' کے غیر فطری اور ملحدانہ تصورات کو کاٹ کر نکال باہر پھینکنے کا طرز عمل ایک قابل تعریف طرز عمل ہے۔ یہ درحقیقت اسلام کے خلاف استعمال کے لیے ایجاد ہونے والے ابلیس کے ایک ہتھیار اور پھندے کو الٹا ابلیسیت اور دجالیت کے خلاف اور اس کا پردہ چاک کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کاوش ہے۔ اس کاوش پر ابلیس اور اس کی آلہ کار عالمی طاقتوں کا غیظ وغضب اور غم وغصہ تو قابل فہم ہے مگر مسلم اہل علم اور قابل احترام دانشور حضرات کا اعتراض اور غصہ ناقابل فہم ہے۔ ایک اچھے آغاز کے طور پر یہ کاوش درحقیقت مسلم دینی تحریکوں کی ایک قابل تحسین کاوش تھی۔ جس کی تعریف کی جانی چاہیے نہ کہ تغلیط۔ ہاں اس کاوش کے دوران اگر مداہنت، مرعوبیت، مغلوبیت اور فکری غلامی کے عناصر در آئیں تو ان کا محاکمہ اور تنقیح کرنا اہل علم کا حق بھی ہے اور فرض بھی (واللہ اعلم بالصواب)۔

ڈاکٹر محمد امین

مغربی فکر وتہذیب سے محدود استفادے کا مسئلہ

جمہوریت اپنانے کے نتیجے میں مغربی تہذیب آئے گی نہ کہ اسلام

'تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی' والے ہمارے مضمون میں مغربی فکر وتہذیب کے رد کرنے کی بات ضمناً آئی تھی وہاں اصل موضوع دوسرا تھا۔مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں ہمارا مکمل نقطۂ نظر، جو ہماری کئی کتابوں اور تحریروں میں موجود ہے[1] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مغربی فکر وتہذیب کو اصولاً ردّ کر دینا چاہیے اور اس کے لیے ہم اسلام اور مغربی فکر وتہذیب میں اختلاف وتناقض کے حوالے سے ہر طرح کے نقلی اور عقلی دلائل دیتے ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان دونوں میں مفاہمت اور تلفیق ممکن نہیں ہے ۔تاہم آخر میں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان بطور استثناء محدثات اور اجتہادی وفروعی امور مین مغربی تہذیب کے ان اداروں سے جو انسانی عقل وتجربے پر مبنی ہوں اور اسلامی تعلیمات ومقاصد کے خلاف نہ ہوں، محتاط و مشروط استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔لیکن استثناء کا مطلب تو استثناء ہی ہوتا ہے مثلاً ہم کھانے میں سبزی پسند کرتے ہیں اور بطور استثناء کبھی ایک آدھ بوٹی بھی کھا لیتے ہیں لیکن برادرم رشید صاحب چاہتے ہیں کہ استثناء کے نام پر ہم مغربی جمہوریت کا پورا اونٹ ہی نگل لیں...... جسے ہمارا تہذیبی معدہ شائد قبول نہ کرے۔اس لیے ہم باقی بات کو تلخیصاً اور اصول استثناء کو یہاں ذرا وضاحت سے بیان کریں گے:

مغربی تہذیب کو ردّ کرنے کے دلائل (خلاصہ)

۱- مغربی فکر وتہذیب جن افکار پر مبنی ہے وہ اسلام کے نقیض ہیں۔ ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، سائنٹزم، میٹریلزم، لبرلزم......وغیرہ۔اللہ کی بجائے انسان کی خدائی کے علمبردار ہیں۔آخرت کی بجائے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور وحی کی ہدایت کو ردّ کرتے ہوئے انسانی عقل اور مشاہدہ وتجربہ کو مدار حقیقت سمجھتے ہیں۔ظاہر ہے یہ سب افکار نقیض اسلام ہیں۔

۲-قرآن وسنت نے ہمیں یہود ونصاریٰ کی اسلام و مسلم دشمنی سے آگاہ اور متنبہ کیا ہے۔

۳-مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک (امریکہ ویورپ اور ان کے ہمنوا) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، جنگیں لڑیں، انہیں غلام بنایا، ان کے

---

۱) مثال کے طور پر دیکھیے 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' ص۴۴ ومابعد اور 'مسلم نشاۃ ثانیہ' ص۲۳۱ ومابعد

مما لک کولوٹا کھسوٹا، ان کا قتل عام کیا، ان کے اجتماعی ادارے ختم کر دیے اور ان کو ہمیشہ غلام رکھنے کے منصوبے بنائے۔ جب انہیں مسلمان مما لک کو مجبوراً کچھ آزادی دینا پڑی تو انہوں نے اقتدار ان عناصر کو منتقل کیا جو ان کے وفادار، ان کے ذہنی غلام اور ان کی تہذیب کے رسیا تھے اور اسی کو مدار ترقی و کامیابی سمجھتے تھے۔ وہ آج بھی مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھا رہے ہیں اور پرامن طریقے سے تعلیم، ثقافت، میڈیا، مالی امداد، فیملی پلاننگ......وغیرہ کے بہانے ان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، انہیں عدمِ استحکام سے دوچار کر رہے ہیں، ان کے ہاں اپنی فکر وتہذیب پھیلا رہے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ مسلم امت زوال سے نہ نکل سکے اور ان کے زیر دست رہے۔ لہٰذا غیرت وحمیت اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ہم مغرب کی پیروی سے باز رہیں۔

۴- دنیا کی ہر زندہ تہذیب اپنی منفرد فکر اور وجود رکھتی ہے۔ اسلامی اور مغربی فکر وتہذیب دونوں منفرد اور مستقل تہذیبیں ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ اپنے منابع میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اداروں اور مظاہر میں بھی۔

مفاہمت اور تلفیق کا امکان

۱- ہر تہذیب کی ایک بنیادی فکر/عقیدہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ایک ورلڈ ویو (تصور الہٰ، تصور انسان، تصور کائنات) اور تصور علم وجود میں آتا ہے۔ اس ورلڈ ویو اور تصور علم کے مطابق علوم وفنون وجود میں آتے ہیں اور ادارے بنتے ہیں۔ اگر دو تہذیبوں کا ورلڈ ویو اور تصور علم ایک دوسرے کے قریب ہو تو ان کے علوم بھی باہم متقارب ہوں گے اور ان کے ادارے بھی ایک دوسرے سے استفادہ کر سکیں گے جیسے یونانی اور مغربی تہذیب۔ اور اگر یہ تہذیبیں اپنی بنیادی فکر اور عقیدے میں ایک دوسرے سے مختلف ومتضاد ہوں تو ان کا ورلڈ ویو اور ان کا تصور علم بھی ایک دوسرے کے برعکس ہوگا۔ ان کے علوم وفنون بھی ایک دوسرے سے متغائر ہوں گے اور ان کے اداروں کے مزاج واہداف بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوں گے اور وہ ایک دوسرے سے بہت کم استفادہ کر سکیں گے جیسا کہ اسلامی اور مغربی فکر وتہذیب کا معاملہ ہے۔

۲- یہ بات اصولاً غلط ہے کہ علم غیر جانبدار ہوتا ہے اور یہ انسانوں کی مشترکہ میراث ہوتا ہے۔ جب یونانی فکر وتہذیب کا مسلم تہذیب سے ٹکراؤ ہوا تو مسلم تہذیب اس وقت توانا وطاقتور تھی اس نے کچھ تھوڑا بہت اثر تو یونانی فکر کا قبول کیا لیکن جلد ہی اسے بحیثیت مجموعی رد کر دیا بلکہ اس کا ردّعمل اتنا شدید تھا کہ آج معتزلہ کا موقف جاننے کے لیے ان کی تحریریں بھی ہمیں نہیں ملتیں اور وہ جمہور کی ان کتابوں سے ڈھونڈنی پڑتی ہیں، جو ان کا رد کرتے ہوئے جمہور علماء نے لکھیں لیکن آج مسلم تہذیب مغلوب ہے اور زوال پذیر ہے، اس کے حکمرانوں اور دانشوروں کی اکثریت مغرب کی فکری غلام ہے اور دوں ہمت لوگ بڑی آسانی سے مغربی فکر وتہذیب پر فریفتہ ہونے لگتے ہیں لہٰذا آج ایمانی حمیت دکھانے کا وقت ہے کہ

جرأت سے کام لے کر مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کو ردّ کر دیا جائے اور دوں ہمت لوگوں کو حیلے بہانے اسے اپنانے کا بہانہ اور موقع نہ دیا جائے۔

پس چہ باید کرد

1- اس کا حل یہ ہے کہ اس امر پر اصرار کیا جائے کہ ہم بہر قیمت اپنے دینی اصولوں پر جمے اور ڈٹے رہیں گے اور انہیں ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔محدثات اور اجتماعی امور (سیاسی نظام، معاشی نظام......وغیرہ) میں جہاں شارع نے ہمیں منصوص تفصیلی احکام نہیں دیے بلکہ بربنائے حکمت پالیسی اصول دینے پر اکتفا کیا ہے اور جن میں رنگ بھرنے کے لیے ہمیں احکام شریعت اور مقاصد شریعت کی روشنی میں نئے اجتہاد و فتویٰ کی ضرورت ہے۔ وہاں ہمیں شعوری کوشش کر کے اسلامی تعلیمات کے تناظر میں رہتے ہوئے تخلیقی سوچ کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور مغربی فکر وتہذیب کے اداروں کی نقالی کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے۔

2- بطور استثناء ہم مغربی فکر وتہذیب کے قائم کردہ اجتماعی اداروں کے ایسے پہلوؤں کو لے سکتے ہیں جو انسانی عقل و تجربے پر مبنی ہوں اور جن میں اسلامی تعلیمات کی مخالفت کا کوئی پہلو موجود نہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زندہ تہذیب اپنے منفرد منابع اور مظاہر رکھتی ہے لیکن وہ کسی ہوا بند ڈبے میں نہیں پنپتی بلکہ اسے اپنے سے پہلے گزری ہوئی تہذیبوں اور معاصر تہذیبوں سے بہرحال کچھ نہ کچھ اخذ و استفادہ کرنا پڑتا ہے۔تاہم یہ استفادہ اکثر و بیشتر فروع اور تفصیلات میں ہوتا ہے نہ کہ بنیادی امور اور اساسی مظاہر میں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی انسانی تہذیب اور قوم میں جزوی حق موجود ہوسکتا ہے۔خود قرآن کہتا ہے کہ کفار مکہ اللہ کو اور اس کی بعض صفات کو مانتے تھے اور یہ بھی کہتا ہے کہ جوئے اور میسر میں بعض منافع موجود ہیں لیکن ان کے مضرات چونکہ ان کے منافع سے زیادہ ہیں لہٰذا شارع نے ان سے منع کر دیا۔اور اہل کتاب تو پہلے پیغمبروں اور ان کی (محرف) شریعتوں کو بھی مانتے ہیں لہٰذا غیر مسلموں کے پاس جزوی حق ہوسکتا ہے جس کا منبع یا تو محرف شدہ سابقہ شریعتوں کے بچے کھچے اثرات ہوں گے یا انسانی عقل و تجربہ اس کا ماخذ ہوگا کہ عقل کی قوت ونفع رسانی سے کس کو انکار ہے۔لیکن اسلام انسانی عقل کو مدار حق نہیں مانتا البتہ اسے مدرک حق ضرور قرار دیتا ہے اور اسے وحی کے تابع کردار دیتا ہے یعنی اگر عقل کی بات مطابق شریعت ہو تو قبول کرلو ورنہ رد کر دو۔

تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ کفار کے پاس جزوی حق ہوسکتا ہے لیکن باطل کی کثرت نے انہیں حق پر ایمان لانے سے محروم کر دیا اور وہ اپنے ضیغ وضلال میں پڑے رہ گئے۔اس طرح کی کوئی صحیح بات یا اس کا کوئی پہلو مسلمان بوقت ضرورت قبول کر سکتے ہیں لیکن حدود وشروط کے ساتھ۔ایسی کسی بات کو حدود و شروط کے ساتھ قبول کرنے کا طریق کار یہ ہے:

- متعلقہ بات کا تعلق اساسی امور و تصورات سے نہ ہو، تفصیل و فروعی امور سے ہو۔
- اس میں کوئی پہلو قرآن وسنت کی تعلیمات اور مقاصد شریعت کی مخالفت کا نہ نکلتا ہو
- اس چیز کو لے کر اس میں ضروری حک و اضافے کیے جائیں تا کہ وہ ہمارے تہذیبی مزاج سے آہنگ ہو جائے اور ہمارا تہذیبی معدہ اسے قبول کر سکے۔
- بشرطیکہ مسلمانوں کے ادارے قرآن وسنت کی بنیادوں پر چلائے جا رہے ہوں اور انہیں قرآن وسنت کی بنیاد پر چلانا ہی امت کے پیش نظر ہو۔

اس کی ایک دو مثالیں ہم عرض کرتے ہیں: مثلاً عہد خلافت راشدہ میں عدلیہ، مقنّنہ اور انتظامیہ کا الگ الگ واضح وجود اور ان کا فعال طریقے سے کام کرنا ہمیں نظر نہیں آتا۔ خلیفہ راشد چونکہ مجتہد ہوتا تھا اور اس کا اخلاقی کردار اتنا ارفع و اعلیٰ تھا کہ اس پر انگلی نہ اٹھائی جا سکتی تھی، اس لیے اس کے بطور جج و مقنن کام کرنے پر بھی نہ کسی کو اعتراض تھا اور نہ اس سے عملاً کوئی خرابی واقع ہوتی تھی لہٰذا اس وقت ایک شخص میں ترکیز اختیارات کوئی نقصان دہ عمل نہیں تھا لیکن آج حکمرانوں کے اخلاق و کردار اس پیمانے کے نہیں رہے لہٰذا کچھ ہرج نہیں کہ مسلمانوں کی مجلس شوریٰ یا مجلس اہل وعقد (یا جو بھی اس کا نام ہو) وہ یہ اختیارات تینوں شعبوں میں تقسیم کر دے تا کہ ایک ہی شخص میں اختیارات کا ارتکاز مضرات کو جنم نہ دے سکے۔ ان تین اداروں میں تقسیم اختیارات کا فارمولہ وضع کرتے وقت کوئی ہرج نہیں اگر یہ دیکھا جائے کہ اس وقت دنیا میں جو سیاسی نظام مروج ہیں ان میں یہ تقسیم کس طرح کی گئی ہے اور اگر کسی سسٹم یا کسی ملک کا تقسیم اختیارات کا فارمولہ انہیں مناسب لگے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے اور ضرورت ہو تو اس میں مزید حک و اضافے کر کے اسے اپنے حسب حال بنایا جا سکتا ہے اور اسے اپنے ہاں لاگو کیا جا سکتا ہے۔ اس مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کر لیا جائے۔

- یہاں ایک اور دقیق بات جس کا لحاظ رشید صاحب نہیں رکھ سکے وہ یہ ہے کہ جو مقاصد اور تصورات اسلام کے سیاسی نظام میں موجود ہیں اور اب مغرب کے سیاسی نظام میں بھی ان کے بعض پہلوؤں کو عقلی بنیاد پر اپنا لیا گیا ہے مثلاً حکومت سازی میں عامۃ الناس کی رائے لینا یا حکومت پر تنقید کی آزادی ہونا...... وغیرہ تو انہیں ہم مغربی جمہوریت کے حوالے سے کیوں لیں یا مغربی جمہوریت کو کیوں اس لیے قبول کریں کہ اس میں یہ اچھی باتیں موجود ہیں جب کہ یہ اچھی باتیں ہمارے اپنے سیاسی نظام میں موجود تھیں اور ہیں۔ قرآن وسنت میں ان کی بنیاد موجود ہے اور خلفائے راشدین اس پر عمل کرتے رہے ہیں لہٰذا یہ تو ہمارے اپنے اصول و تصورات ہیں انہیں ہم مغرب کی جمہوریت کے حوالے سے کیوں لیں۔ کیا محض مغرب کی غالب تہذیب اور جمہوریت کے حق میں اس کے پروپیگنڈے کی وجہ سے؟

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ہمیں مغربی جمہوریت کو بحیثیت مجموعی ردّ کر دینا چاہیے اور اسلام کے سیاسی نظام کا احیاء کرنا چاہیے نام خواہ اس کا 'خلافت' ہو یا کچھ اور (کیونکہ خلافت کے صحیح تصور اور معیار کے

مطابق بھی ہم ماضی میں اچھا کام نہیں کر سکے اور آمریت و وراثت کی طرف نکل گئے)۔ کیونکہ جب تک ہم اسلام کا سیاسی نظام قائم نہیں کریں گے، اس کی انفرادیت اور مستقل حیثیت نہیں بنے گی اور مغربی جمہوریت کے مقابلے میں تو کبھی بھی نہیں بنے گی (اور یہی وجہ ہے کہ مغرب مسلمان ملکوں میں اپنی جمہوریت پھیلانا اور مروج کرنا چاہتا ہے اور افغان یا کوئی دوسری مسلمان قوم جب اسلام کے سیاسی نظام کا احیاء کرنا چاہتی ہے تو مغرب ڈیزی کٹر اور نیپام بم لے کر اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے تاکہ اسلام کا سیاسی نظام کہیں جڑ نہ پکڑ لے اور دوسروں کے لیے مثال نہ بن جائے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں اور اصرار سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا سیاسی نظام، اپنا معاشی نظام، اپنا عدالتی نظام...... قائم کرنا چاہیے اور ایسا کرتے ہوئے اپنے اصول، اپنے ماضی کے تجربات اور اپنی آج کی ضرورتیں سامنے رکھنی چاہئیں اور مغربی تہذیب کے اداروں جمہوریت، سرمایہ داری، اس کے عدالتی نظام...... وغیرہ کی پیروی اور نقالی سے باز آ جانا چاہیے۔

مغرب تو یہی چاہتا ہے کہ ہم اس کے ذہنی غلام بنے رہیں، اس کی بالا دستی کو مان کر اس کی ترقی اور کامیابی کے گن گاتے رہیں، ہر معاملے میں اس کی پیروی کرتے رہیں اور کبھی اپنے نظریات پر کھڑے ہو کر اپنے نظام وضع کر کے سر اُٹھا کر زندگی نہ گزاریں لہٰذا ہم اپنے موقف کو صحیح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کے چھوٹے اور بڑے، انفرادی اور اجتماعی سب معاملات میں اللہ کے دین کی پیروی کرنی چاہیے اور غیر دین اللہ کو ترک کر دینا چاہیے۔ ہمیں آج کے کفر اور طاغوت (مغربی فکر و تہذیب) کو بھی اصولی طور پر ردّ کر دینا چاہیے بلکہ عملاً بھی اسے ردّ کر دینا چاہیے کہ اس کا الحاد اور بے دینی پر مبنی ہونا شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اس میں بلاشبہ کچھ خیر بھی ہے لیکن اس کا شر اور ضرر اس کے خیر پر غالب ہے لہٰذا اس کو اپنانے میں کوئی خیر نہیں ہے بلکہ اسے ردّ کرنے اور اسلام کو اپنانے میں سراسر خیر ہے۔

یہ نقطۂ نظر جب ہم اپنا لیں اور اس پر عمل کر کے اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اللہ کی شریعت کے مطابق گزارنے لگیں تو اجتماعی نظام کی تفصیلات طے کرتے ہوئے اہل مغرب سے کوئی اچھی بات لی بھی جا سکتی ہے (جس کا طریقہ کار ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے)۔ آٹے میں نمک کے برابر لے لیں تو خیر ہے لیکن یاد رکھیے موجودہ حالات میں مغربی جمہوریت آپ کے لیے بدو کا اونٹ ہے، آپ اسے تھوڑی سی جگہ اپنے خیمے میں گھسنے کی دیں گے تو یہ بالآخر سارے خیمے پر قابض ہو جائے گا اور آپ اپنے اسلام سمیت خیمے سے باہر ہوں گے لہٰذا مغرب سے اچھی چیزیں لیتے ہوئے یہ تنبیہ ضروری ہے کہ اس کے نتیجے میں ہم مغربی فکر و تہذیب کی غلامی کی راہ تو ہموار نہیں کر رہے جیسا کہ ہمارے سامنے اور ہماری آنکھوں دیکھتے یہ ہو رہا ہے کہ حیلے بہانے مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کی جاتی ہے اور اسلامی اصول و اقدار پر عمل نہیں کیا جاتا۔ یہ چیز اسلامی شناخت کے لیے تباہ کن ہے اور اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

مغربی فکر و تہذیب آصف جیلانی

مغربی تہذیب کی پیروی کا جنون

۹/۱۱ کے ایک ماہ بعد امریکہ کے وزیر دفاع رمز فیلڈ نے دو، ارب ڈالر کی لاگت سے تیار شدہ B52 بمبار طیارہ کے سامنے کھڑے ہو کر امریکی فضائیہ کے ان ہوا بازوں کو جو افغانستان کے عوام سے انتقام لینے کے لیے بمباری کے مشن پر روانہ ہو رہے تھے، خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے سامنے صرف دو راستے ہیں: یا ہم اپنے طرز زندگی کو بدل دیں اور ان کا طرز زندگی اختیار کر لیں یا ہم ان کے انداز زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیں۔ رونلڈ رمز فیلڈ نے نہایت پُراعتماد انداز سے کہا کہ ہم نے موخر الذکر راستہ چنا ہے اور آپ کا کام اس مشن کی تکمیل ہے۔ رونلڈ رمز فیلڈ کے اس اعلان کے بعد امریکا نے پچھلے تیرہ سال میں افغانستان، عراق ہی نہیں بلکہ لیبیا، پاکستان، یمن اور صومالیہ میں ۹۵ ہزار حملے کیے ہیں اور ان ملکوں میں عوام کا طرز زندگی بدلنے کے لیے دس لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے اور لاکھوں امریکی حملوں میں زخمی ہو کر عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے اور غربت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں امریکی ڈرون حملوں سے پہلے ہی ہم نے بڑے فخر کے ساتھ اپنا طرز زندگی بدل دیا اور رونلڈ رمز فیلڈ کی خواہش کے مطابق ان کی تہذیب اور ان کا اندازِ زندگی اختیار کر لیا۔ مغربی طرزِ زندگی کی تقلید میں ہم ایسے سرشار ہوئے ہیں کہ ہم نے اپنی تہذیب، اپنی روایات اور اپنی قدروں کو یکسر بھلا دیا ہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایسے کوشاں ہیں کہ ان کو تج دیے بغیر ہم ترقی کی راہ حاصل نہ کر پائیں گے۔

مغرب کی اندھی تقلید میں ہم نے سب سے بڑی قربانی تعلیم کے شعبے میں دی ہے۔ ساری دنیا میں بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم کے مراحل تک جاری رہتا ہے۔ نہ جانے پاکستان میں ہم نے اپنے ذہنوں پر یہ کیوں طاری کر لیا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم جہالت اور پس ماندگی کی نشانی ہے اور دنیا کے اعلیٰ ماہرین تعلیم کے اس اصول کو کیوں غلط ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان میں جتنی تیزی سے سیکھتا ہے اتنی تیزی سے غیر مادری زبان میں نہیں سیکھ سکتا۔ ہم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ چینی، جاپانی، جرمنی، فرانسیسی اور دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں نے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ہم نے اپنی مادری زبان میں تعلیم کے نظریے سے ایسے قطع تعلق کر لیا ہے کہ

جیسے یہ ہمیں ترقی کی راہ سے بھٹکا دے گا۔ انگلش میڈیم اسکولوں کا جنون پورے ملک پر ایسا چھا گیا ہے کہ انگریزی ناموں کے اسکول ترقی کی جادوئی کلید سمجھے جاتے ہیں، چاہے ان کا تعلیمی معیار کتنا ہی پست کیوں نہ ہو اور سارا زور بچے کو انگریزی رائمز رٹانے پر ہی ہو۔ انگلش میڈیم اسکولوں کے اس جنون نے تعلیم کو دو طبقوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور دراصل یہی وجہ ہے کہ انگریزی پیر تسمہ پا کی طرح ہم پر سوار ہو گئی ہے۔

اس دور میں بھی جب ہم انگریزوں کے غلام تھے، ہم نے اپنے اوپر انگریزی اتنی مسلط نہیں کی تھی، جتنی کہ آزاد ہونے کے بعد ہم اس کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ انگریزی پڑھنا اور انگریزی ادب سے گہرا شغف رکھنا قابل ستائش ہے، لیکن ہم نے انگریزی کا جو جن سوار کر لیا ہے، اس کی وجہ سے ہماری شناخت کھو گئی ہے۔ پچھلے دنوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں جب وزیر اعظم نواز شریف کو انگریزی میں خطاب کرتے دیکھا اور ہندوستان کے وزیر اعظم نریندر مودی کو اپنی قومی زبان ہندی میں خطاب کرتے سنا تو شرم کے مارے سر جھک گیا۔ اس عالمی فورم میں جہاں سب قائدین اپنی اپنی قومی زبانوں میں خطاب کرتے ہیں اور ان کے ترجموں کا اہتمام ہوتا ہے، وہاں یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پاکستان کے وزیر اعظم کو اپنی قومی زبان کے بجائے اپنے پرانے آقاؤں کی زبان میں تقریر کرنے کی کیوں سوجھی؟ یہ احساس کمتری اور ذہنی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے ملک میں انگریزی کی ایسی زبردست یلغار ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری زبان مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ زبان کو مسخ کرنے کے عمل میں ہمارے ٹیلی وژن چینلز پیش پیش ہیں۔ خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں میں جو انگریزی زدہ زبان استعمال کی جاتی ہے اسے سن کر اردو کی بپتا پر رونا آتا ہے۔ ہر جملہ میں جا بجا انگریزی کے پیوند چلا چلا کر کہتے ہیں کہ میں اردو نہیں کوئی اور زبان ہوں۔ لفظ لیکن کی جگہ۔ بٹ۔ میرے خیال کی جگہ آئی تھنک۔ ویلکم بیک، آئی ول ٹیک اے شارٹ بریک اور پھر تجزیہ کاروں کی رٹی رٹائی اصطلاحات، اسٹیک ہولڈرز، آن ون پیج۔ مائنڈ سیٹ، کانفیڈینس، ڈیبیٹ۔ ایک Narrative یہ ہے اور تازہ ترین خبر کی جگہ بریکنگ نیوز وغیرہ سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ ایک چینل پر ایک خاتون مشورہ دے رہی تھیں کو ئیک ڈسیشن میک نہ کریں۔ اس کے ڈزاسٹرس رزلٹ ہو سکتے ہیں۔ کھانے پکانے کے ایک پروگرام میں خاتون بار بار یہ کہہ رہی تھیں کلیجی میں آپ کی ڈش ہو تو ریڈ چلیز کی جگہ بلیک پیپر add کر سکتی ہیں اور سالن پلیٹ میں نکالتے وقت بار بار کہہ رہی تھیں کہ اسے ڈش آؤٹ کر لیں۔ خدا جانے یہ کون سی زبان ہے؟

انگریزی کے ان الفاظ کے علاوہ جو اردو میں در آئے ہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ٹیلی وژن کے بیشتر پروگراموں کے نام بھی انگریزی میں ہیں۔

آف دی ریکارڈ، آن دی فرنٹ، الیونتھ آور، کیپیٹل ٹاک، نیوز روم، نیوز نائٹ وغیرہ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو اتنی مفلس اور تہی دست ہوگئی ہے کہ پروگراموں کے نام اردو میں رکھنے مشکل ہیں۔کہیں آپ نے چین، فرانس، یا ایران میں دیکھا ہے کہ وہاں ٹیلی وژن پروگراموں کے نام انگریزی میں ہوں؟

یہ تو بات تھی کہ کس طرح ٹیلی وژن چینلز نے اردو کی درگت بنائی ہے لیکن مغرب کی اندھی تقلید میں ہم نے اپنے تشخص اور شناخت کو کھو دیا ہے اور اپنی روایات کو ایسے ترک کر دیا ہے کہ جیسے یہ ایک بوجھ ہے۔اکبرالہ آبادی کو تو اس بات کی شکایت تھی کہ:

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد و وفا بھول گئے
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزہ بھول گئے

لیکن ہم پاکستانیوں نے تو اپنے وطن میں رہتے ہوئے امریکی کوکا کولا اور پیپسی کولا کے مقابلہ میں فالسے کے شربت، گنے کے رس اور سکنجبین کا مزہ بھول گئے۔ایک طرف ہم عراق، افغانستان اور لیبیا میں امریکیوں کے جنگی ظلم وستم کے خلاف احتجاج میں پیش پیش رہتے ہیں، لیکن دوسری طرف غٹا غٹ کوک اور پیپسی پیتے ہیں اور اس کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔کس قدر منافقت ہم نے اپنے اوپر طاری کر لی ہے۔ کباب، سموسوں، پکوڑوں اور دہی بڑوں کو تج کر کے برگر، چکن ونگس، چپس اور چکن نگٹس پر جان چھڑکتے ہیں۔

حال ہی میں ہم نے اپنے مہذب سیاسی اجتماعات کو ترک کر کے ڈھول تاشوں، بھنگڑا، نغموں اور رقص سے بھرپور میلوں کو اپنا لیا ہے۔اب تک ہمارے سیاسی جلسوں میں مقرر اپنی تقریروں میں اساتذہ کے اشعار سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے تھے اور حاضرین کے دل گرماتے تھے، لیکن اب تقریر کے بیچ میں ڈسک کے بجائے الٹے سیدھے نغمے بجاتے ہیں اور رقص کے لیے اکساتے ہیں۔ایسے میں عوام کے مسائل کے بارے میں کیا خاک بات ہوسکتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آزادی کے نام پر ذہنی غلامی کی زنجیریں پہن لی ہیں (بشکریہ'بیداری)

فھم دین

پروفیسر مقصود احمد

اسلام - حریت فکر کا داعی

انسان اور حیوان میں فرق کرنے والی بڑی چیزوں میں سے ایک زبان کا استعمال ہے اور دوسرا سوچ بچار کرنے کی صلاحیت کا۔ انسان کے سوچنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی بنا پر اسے اللہ تعالیٰ نے اختیارات سے بھی نوازا ہے اور زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا شرف بھی بخشا ہے۔

ہر انسان کا ذہن دوسرے انسان سے مختلف ہے۔ کسی دو انسانوں کا ذہن بالکل ایک جیسا نہیں ہوسکتا ہے اور ہر ذہن سوچنے کی صلاحیت کا مالک ہے۔ جب تک انسان انسان ہے وہ سوچنے پر مجبور ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بنی نوع انسان کی بھلائی اور بہتری کے لیے استعمال میں لائے اور منفی اور تخریبی سوچ سے اجتناب کرے۔ مگر سوچنے کا عمل روکا نہیں جاسکتا ہے۔

حضرت آدم سے اب تک انسانی زندگی، انسانی رہن سہن اور انسانی تمدن میں جتنی بھی ترقی دکھائی دیتی ہے وہ سب غور و فکر اور خیالات کے مثبت استعمال ہی کی مرہون منت ہے۔ جب یہ عمل رک جاتا ہے تو انسانی تہذیب و تمدن کی نشو ونما کا عمل بھی رک جاتا ہے اور ایسا انسانی گروہ جس میں ذہنی عمل رک جاتا ہے وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا اور اُس کا وجود زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اس کے برعکس ایسا گروہ، جماعت، تنظیم، قوم جو موجودہ حالات میں تبدیلی لانے کا عزم رکھتی ہو اُس میں حریت فکر کا پایا جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا کا جسم کے اندر جانا ضروری ہے۔ اگر ایسا گروہ اپنے اجزائے ترکیبی میں حریت فکر پر پابندی لگا دیتا ہے تو وہ کوئی تبدیلی لانا تو درکنار موجودہ صورت حال کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے عضو معطل بن کے رہ جاتا ہے اور اس کا ہونا نہ ہونا یکساں ہوجاتا ہے۔

جب ایک سے زیادہ افراد مل کر ایک گروہ، جماعت، تنظیم یا معاشرہ بناتے ہیں تو اس کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی جملہ انفرادی صلاحیتوں کو کس قدر مجتمع کر کے انھیں استعمال میں لاتے ہیں۔ جس قدر وہ بہتر اور بھرپور انداز میں یہ کام کریں گے اسی قدر اُن کی نشو ونما اور ترقی کی رفتار تیز ہوگی اور خدانخواستہ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ایک ہجوم اور بھیڑ تو ہوسکتا ہے ایک منظم گروہ

نہیں ہوسکتا اور وہ کسی منظّم قوت کا مقابلہ ہرگز نہیں کرسکتا۔

کسی گروہ کو منظّم کرنے کے لیے صرف جسمانی صلاحیتیں جمع کرنا ہی کافی نہیں ہوتا، اُس کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا ارتکاز جسمانی صلاحیتوں سے بھی بڑھ کر اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو جسمانی صلاحیتوں کا بھی رُخ متعین کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اگر چند افراد یہ خیال کرلیں کہ صرف انہی کی ذہنی صلاحیتیں کامیابی کے لیے کافی ہوں گی تو وہ غلطی پر ہوں گے اور آخر کار ناکامی و نامرادی اُن کا مقدر بن جائے گی۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

لہٰذا حریت فکر کسی بھی گروہ، تنظیم یا قوم کی اجتماعی زندگی کی نشوونما، ترقی اور کامیابی کے لیے جسم کے اندر خون کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے، دراصل وہ اپنی ہلاکت کا اہتمام کرتا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کے خالق نے جو انسانی ذہن کا موجد ہے اُس نے حریت فکر پر پابندی نہیں لگائی ہے بلکہ عقل وفکر کو استعمال میں لانے کے لیے بار بار اُبھارا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ہیں انہیں جانوروں سے بھی بدتر مخلوق قرار دیا ہے۔ یہ کتاب ساری کی ساری ایسے احکامات وتعلیمات سے بھری پڑی ہے۔ دراصل اس کتاب کے لکھنے کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خالق کائنات کے نزدیک غوروفکر اور تحقیق واختراع کی کس قدر اہمیت ہے۔

نہ صرف یہ کہ یہ احکامات آئے ہیں بلکہ نبی کریم ﷺ جو بنی نوع انسان کی طرف اللہ تعالیٰ کے بھیجے گئے آخری رسول ہیں، اُن کا عمل بھی اس بات کا شاہد ہے کہ آپؐ نے بھی اس حریت فکر پر پابندی نہیں لگائی بلکہ اس سے استفادہ ہی کیا ہے۔ اس موقف کی وضاحت کے لیے بیسیوں صدی میں عالم اسلام کے ایک عظیم مفکر جناب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ یوں رقم طراز ہیں۔

''سرکارِ رسالت مآبؐ نے جس حریت فکر کی تخم ریزی کی تھی اور احکام الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلے میں آزادی رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور برتاؤ سے سکھایا تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابہ کرام تمام انسانوں سے زیادہ احکام الٰہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلے میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں جو بڑے آدمی تھے جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کررہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ ردّ بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین، رسول

اللہ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ اس آزادیٔ رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں اس کو نہ صرف گوارا کیا، بلکہ اس کی ہمت افزائی کی اور کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں اس لیے ہماری بات کو بے چون و چرا تسلیم کرو۔

خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس نے اس حریت فکر کو تخویف اور اطماع (ڈرا دھمکا کر اور لالچ کے ذریعے) ظلم وستم اور زر پاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی مگر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک یہ روح مسلمانوں میں باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ امرا اور حکام کے مقابلے میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ روح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے جس کی عزت وعظمت اس کے پہنائے قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے اور اس کے مقابلے میں بھی آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی اسپرٹ ہم کو اس دور کے اہل علم میں نظر آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی اور حضرات تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہوگا مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابہ کرام کی آراء پر نقد کرتے تھے، ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے کو قبول کرتے تھے۔ اختلاف صحابہ میں امام مالکؒ کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں:

'خطا و صواب فانظر فی ذلک'

''ان کی آرا میں خطا بھی ہے اور صواب بھی۔ تم خود غور کر کے رائے قائم کرو۔''

اسی طرح امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے:

'احد القولین خطا والماثم فیه موضوع'

''دو مختلف اقوال میں سے ایک بہرحال غلط ہوگا۔''

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے:

'هذا رایی فان یکن صواباً فمن الله وان یکن خطا فمنی واستغفر الله'

'یہ میری رائے ہے اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اگر غلط ہے تو میری خطا

ہےاور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔'

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"لاتجعلوا خطا الرای سنة للامة".

'رائے کی غلط کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ۔'

حضرت ابن مسعود کا قول ہے:

"الا لایقلدن احد دینه رجلا ان امن امن وان کفر کفر فانه لااسوة فی الشر".

'خبر دار کوئی شخص اپنے دین کے معاملے میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن رہا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہوگیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے۔'

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

'انما انا بشر اخطئ وأصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنة فخذوه و کلما لم یوافق الکتاب والسنة فاترکوه'

'میں ایک انسان ہوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔تم میری رائے میں نظر کرو۔ جو کچھ کتاب وسنت کے موافق پاؤ، اسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو،اسے چھوڑ دو۔'

امام مالکؒ ہی کا یہ واقعہ تواریخ کی کتب میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی ان کی کتاب،الموطا کو تمام عالم اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کرکے صرف مذہب مالکی کو رائج کردے۔مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں کی تحقیق، آزادیٔ رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں:

"لایحل لاحدان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا".

'کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہو تاوقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔'

امام شافعی فرماتے ہیں:

'مثل الذی یطلب العلم بلاحجة کمثل حاطب لیل یحمل حزمة حطب وفیه افعی للدغه وهو لایدری'

'جوشخص حجت کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چن رہا ہے، وہ لکڑیوں کا گٹھا اُٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اس کو ڈس لے گا'

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریت فکر و نظر اور آزادانہ طلب حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو خود نبیﷺ اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امراو حکام اور علماء ومشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا، درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کو باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ دل اور دماغ کی غلامی، فکر اور نظر کی غلامی، روح اور جسم کی غلامی، ان پر پوری طرح مسلط ہوگئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ مدرسے والوں نے خداپرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اُتارا۔ خانقاہ والوں نے 'بیعت' کے مسنون طریقے مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا۔ جب غیراللہ کے سامنے تا بہ زمیں سر جھکنے لگیں، جب غیراللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اُٹھانا بھی سوءِ ادب ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان، انسان کا خداوند اور مالک اور ان داتا بن جائے، جب انسان بذات خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استناد (سند) سے بری قرار دیا جائے۔ جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی، عملاً اس طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے، جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو۔

'الا نعبد الا الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله' (آل عمران ۳: ۶۴)

'یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم

میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے'

کے ساتھ دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ (اشارات، ترجمان القرآن، جلد ۹، عدد ۳، ص ۱۷۲-۱۷۵) حکمت مودودی ترجمان القرآن مئی ۱۹۹۸ء)۔

تاریخ انسانی کے ایک عظیم المرتبہ عالم پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

'اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہوگیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول، نقل مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا جدید اور تخلیقی طریقوں سے بخوبی جواب دے سکیں'

اس لیے معاشرے کو صحت مند رکھنے کے لیے، اُسے باقی رکھنے کے لیے اور مزید نشوونما دینے کے لیے حریت فکر اور تخلیقی عمل انتہائی ضروری ہے۔

تحقیقی اور تخلیقی عمل نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری زندگی کا رویہ غیر اسلامی بن چکا ہے۔ ہمارے سارے کام کاج ہماری خواہشات اور آرزوؤں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں اور اس لیے بے نتیجہ رہتے ہیں۔ ہمارے اندر قوت عمل کی کمی واقع ہوچکی ہے۔ ہم نے ٹھوس معلومات جمع کرنے اور اُن کی روشنی میں منصوبہ بندی کرنے کے ادارے قائم نہیں کیے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں سب سے پیچھے اور دوسروں کے دست نگر بن چکے ہیں کیونکہ صدیوں کے اس عمل سے ہمارے ذہن جمود کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہمارے اندر وسعت نظر اور وسعت ظرف ختم ہوچکی ہے۔ ہم تقلید محض کا شکار چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں بدست وگریباں رہتے ہیں۔

اس ساری صورت حال کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے ایک ایک فرد، ایک ایک بچے کے اندر تحقیق وتخلیق کی تڑپ، جذبہ، ذوق اور صلاحیت پیدا کی جائے۔ اس سے عمومی آگہی پیدا کی جائے اور ہر طرف ایسے کلچر کو فروغ دیا جائے کہ سوچ بچار، مشاہدہ، تجزیہ، تحقیق اور تخلیق ہمارے مزاج کا ایک لازمی حصہ بن جائیں۔ اس کے لیے ہمیں خصوصاً اپنے نظام تعلیم کی تشکیل جدید کرنا ہوگی کیونکہ

شیخ مکتب ہے ایک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

اس کے ذریعے سے ہمیں اپنے مستقبل کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں جولانیٔ فکر کے حامل افراد

کارتیار کرنا ہوں گے جو عصر حاضر کے ہر قسم کے چیلنج کا احسن انداز میں بہتر سے بہتر حل ڈھونڈ کر ملک و ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں اور ہمیں اپنے مسائل حل کرنے کے لیے باہر سے افراد درآمد نہ کرنا پڑیں۔

لیکن یہ کام جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے لیکن کون سی مشکل ہے جو حل نہ ہو سکے۔شرط یہ ہے کہ منزل کو پہچان لیا جائے۔اس کا تعین کر لیا جائے۔اپنا رُخ اس طرف کر کے عمل کا آغاز کر دیا جائے کیونکہ کسی بھی طویل سفر کا آغاز تو پہلے ایک قدم اُٹھانے ہی سے ہوتا ہے۔جب پہلا قدم اُٹھ جاتا ہے اور اُس کے پیچھے ایک ایک قدم اُٹھتا چلا جاتا ہے تو منزل دور نہیں رہتی ہے اور ایک دن انسان اپنی منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے اور پھر جب ہم ایمان کی قوت سے سرشار ہو کر اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کی خاطر اُس کے احکامات کی روشنی میں اس سفر کا آغاز کریں گے تو ہماری رفتار دنیا کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہو گی اور جو سفر دُنیا کی دیگر قوموں نے ایک طویل عرصے میں طے کیا ہے، ہم اُن کی نسبت بہت تھوڑے عرصے میں طے کر لیں گے اور یوں اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی امامت کا جو عظیم منصب ہمارے سپرد کیا ہے، اُسے انجام دینے کے قابل ہو سکیں گے، ان شاء اللہ۔

البرہان

ہم نے پروفیسر مقصود صاحب کا مضمون شائع کر دیا ہے، اگرچہ اس میں حوالہ جات نہیں دیے گئے اور حریت فکر کی حدود و شروط پر اور موجودہ مسلم ذہن پر مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور لبرلزم کے اثرات پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی۔اگر قارئین میں سے کوئی صاحب اس پر اضافہ یا نقد کرنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

ذرا سوچیے!

مسجدوں پر کوئی داخلہ فیس نہیں ہے مگر وہ پھر بھی سنسان ہیں

سینما اور کلب پر انٹری فیس ہے مگر وہ پھر بھی فل بھرے رہتے ہیں

کیا ہم مسلمان فری میں جنت نہیں لینا چاہتے اور پیسے دے کر دوزخ خرید رہے ہیں؟

(عطاء محمد جنجوعہ)

ہماری سرگرمیاں

مدیر

ملی مجلس شرعی

اتحاد امت کانفرنس

ملی مجلس شرعی کی ایک اتحاد امت کانفرنس ہوٹل پاک ہیریٹیج (شاہجہان بینکوئٹ ہال) ۲۸ ڈیوس روڈ لاہور میں ۲۱ دسمبر ۲۰۱۴ء کو ہو رہی ہے جس میں پاکستان بھر سے جید اور ثقہ علماء شرکت کریں گے۔ اس کانفرنس کا موضوع اتحاد بین العلماء والمسالک ہے۔

دورۂ گوجرانوالہ اور مسئلہ سود

مجلس کے ایک وفد نے حال ہی میں گوجرانوالہ کا دورہ کیا اور چیمبر آف کامرس کے کمیٹی روم میں سود کے حوالے سے ایک علمی سیمینار سے خطاب کیا۔ اس سیمینار کی روداد مولانا زاہد الراشدی صاحب نے لکھی ہے جو درج ذیل ہے:

ملی مجلس شرعی پاکستان کے مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کا مشترکہ فورم ہے، جو گزشتہ آٹھ سال سے نفاذِ اسلام کے لیے علمی و فکری جدوجہد میں مصروف ہے۔ مولانا مفتی محمد خان قادری اس کے سربراہ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین سیکرٹری جنرل ہیں۔ دیگر رہنماؤں میں مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی، علامہ احمد علی قصوری، مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا عبدالمالک، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، حافظ عاکف سعید، مولانا قاری محمد یعقوب شیخ اور علامہ خلیل الرحمٰن قادری بطور خاص قابل ذکر ہیں جب کہ راقم الحروف بھی شروع سے مجلس کے ساتھ شریک کار ہے اور سینئر نائب صدر کے طور پہ خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ۲۶ نومبر ۲۰۱۴ء کو چیمبر آف کامرس گوجرانوالہ میں ملی مجلس شرعی کے مرکزی رہنماؤں نے گوجرانوالہ شہر کے مختلف مکاتب فکر کے علماء سے ملاقات کی اور اس موقع پہ تحریک انسداد سود کے حوالے سے مولانا مفتی خان محمد قادری کی زیر صدارت سیمینار منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ملی مجلس شرعی کا تعارف اور اس کی کارکردگی پر گفتگو کی۔ راقم نے تحریک انسداد سود پاکستان کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے تحریک کے تقاضوں اور صورت حال سے شرکاء کو آگاہ کیا اور اس کے علاوہ مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا عبدالمالک، علامہ خلیل الرحمٰن قادری، مولانا خالد حسن مجددی، مولانا مشتاق احمد چیمہ، مولانا محمد ریاض خان سواتی، مولانا حافظ ابرار ظہیر، مولانا حافظ گلزار احمد آزاد، جناب محمد شاہد، مولانا اظہر حسین فاروقی اور دیگر علماء کرام نے خطاب

کیا۔ان خطابات میں جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ملی مجلس شرعی گزشتہ آٹھ سال سے جن مقاصد کے لیے کام کررہی ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱- بین العلماء والمسالک تقارب، رواداری اور اتحاد کی کوشش کرنا،۲-معاشرے کو درپیش مسائل کے بارے میں متفقہ اور مشترکہ موقف اپنانا۔ ۳-سود کی نحوست وشناعت کے بارے میں عوام وخواص میں آگاہی پیدا کرنا اور اس کے خاتمہ کے لیے محنت کرنا۔۴-دینی مدارس میں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ وطلباء کے لیے بھی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا۔۵-ہر مسجد میں ایک فلاحی کمیٹی قائم کرکے محلّہ کے غریبوں محتاجوں اور بیواؤں کی مالی معاونت کا اہتمام کرنا۔

ملی مجلس شرعی نے ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے قیام پاکستان کے بعد تمام مکاتب فکر کے اکابر کے مرتب کردہ متفقہ ۲۲ دستوری نکات پر دور حاضر کے تمام مکاتب فکر کے ۱۵۷ اکابر علماء کرام کو لاہور میں دو سال قبل ایک کنونشن میں جمع کرکے ان نکات کی دوبارہ توثیق کا اہتمام کیا اور عصری تقاضوں کے مطابق ۱۵ توضیحی نکات شامل کرکے سب کی طرف سے دوبارہ متفقہ اعلان کروایا کہ نفاذِ اسلام پہ تمام مکاتب فکر متفق ہیں۔اس حوالہ سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور تمام مکاتبِ فکر انہی ۲۲ نکات کی روشنی اور دائرہ میں نفاذ اسلام کے خواہاں ہیں۔سودی نظام کے حوالہ سے سیمینار میں بتایا گیا کہ ملی مجلس شرعی نے وفاقی شرعی عدالت کے جاری کردہ سوالنامہ پر تمام مکاتب فکر کے جید علماء کی مشترکہ کمیٹی کی طرف سے جواب مرتب کرکے اسے امت مسلمہ کے متفقہ موقف کے طور پہ عدالت میں جمع کرادیا ہے اور عوامی بیداری کے لیے تحریک انسداد سود کے عنوان سے مختلف سطحوں پہ جدوجہد جاری ہے اور یہ سیمینار بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کی ایک تازہ سروے رپورٹ کے مطابق ملک کے ۹۵ فیصد عوام سودی نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں اس لیے حکومت کو اس کے خاتمہ کے لیے لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہیے اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق سودی نظام کے خاتمہ میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے جب کہ پرائیویٹ سطح پر سود کا لین دین قانوناً منع ہونے کے باوجود ملک میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور گلی گلی محلّہ محلّہ سودی لین دین کے حلقے موجود ہیں۔اس سلسلے میں لاہور کے ڈی آئی جی پولیس (آپریشنز) ڈاکٹر اشرف حیدر نے تھانوں کی سطح پر سودی لین دین کرنے والوں کی فہرستیں مرتب کرنے اور ان کے خلاف کارروائی کا مبینہ طور پہ جو آرڈر جاری کیا ہے وہ خوش آئند ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے دیگر پولیس افسران سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بھی اس سلسلے میں قانون کی عملداری کا اہتمام کرائیں۔سیمینار میں طے پایا کہ علماء کرام اور خطباء عظام کو اس بارے میں خصوصی توجہ دلائی جائے اور ان کی بریفنگ اور آگاہی کے لیے مجالس کا اہتمام کیا جائے تاکہ وہ سود کی نحوست وشناعت سے عوام کو بہتر طور پہ آگاہ کرتے ہوئے اس مہم کو آگے

بڑھا سکیں۔ ملی مجلس شرعی پاکستان کے صدر جناب مولانا مفتی خان محمد قادری سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے علماء کرام پہ زور دیا کہ وہ باہمی اختلافات کو علمی، فقہی دائروں میں رکھتے ہوئے مشترکہ ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کا اہتمام کریں اور باہمی ملاقاتوں، رابطوں، افہام و تفہیم اور باہمی اشتراک وتعاون کے ذریعے وحدت امت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب کو اسلام اور امت کے عنوان پہ کام کرنا چاہیے کیونکہ یہ اس وقت امت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

تحریک اصلاح تعلیم

'تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی' پر علمی مذاکرہ

البرہان شمارہ ستمبر/اکتوبر ۲۰۱۴ء میں راقم کے مضمون 'تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی' کے حوالے سے معروف تعلیمی ماہر اور دانشور پروفیسر ملک محمد حسین صاحب (جوہر آباد۔خوشاب) کی تحریک پر ایک علمی مذاکرہ ۱۶ نومبر ۲۰۱۴ء کو منصورہ ڈگری کالج لاہور میں ہوا جس میں پاکستانی معاشرے میں تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی کے حوالے سے غور و فکر ہوا۔ پروفیسر ملک صاحب نے اپنی افتتاحی گفتگو میں کہا کہ:

بنیادی سوالات جن پر غور و خوض کی ضرورت ہے یہ ہیں:

۱- کیا فرد کی تعمیر اور سماجی تبدیلی میں کوئی تعلق ہے؟

۲- فرد کی تعمیر سے ہماری کیا مراد ہے اور سماجی تبدیلی کے مظاہر ہماری نظر میں کیا کیا ہیں؟

۳- فرد مطلوب کی تعمیر سے سماجی تبدیلی کس طرح وقوع پذیر ہوگی؟

۴- ہمارے ملک میں فرد کی تعمیر کے لیے جو تعلیمی اور تربیتی وسائل میسر ہیں ان کا حجم کیا ہے؟

تقریباً تین لاکھ سکول- تقریباً 5 ہزار کالجز- تقریباً 150 یونیورسٹیاں اور انسٹی ٹیوٹس-تقریباً 20-15 ہزار دینی مدارس- سال بھر میں 52 خطبہ ہائے جمعہ- دروسِ قرآن اور فہم دین کی روزانہ ہزاروں مجالس-تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، اہل حدیث حضرات، جماعتِ اسلامی کے بڑے بڑے سالانہ اجتماعات- ریڈیو ٹیلی وژن کے روزانہ سینکڑوں دینی/مذہبی پروگرامز-سینکڑوں دینی/مذہبی رسائل اور اخبارات کی مذہب پر ہفتہ وار خصوصی اشاعتیں- درج بالا وسائل کے ہوتے ہوئے کیا فرد کی تعمیر نہیں ہو رہی؟ اگر نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا درج بالا وسائل تعمیر فرد کی راہ میں رکاوٹ ہیں؟ کیا درج بالا وسائل کو راہِ راست پر لایا جاسکتا ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟ اور نہیں تو کیا کیا جائے؟

۵- ڈاکٹر محمد امین صاحب نے اپنے مقالہ میں جو کچھ کہا ہے کیا اُس سے کوئی حکمتِ عملی اور کوئی لائحہ عمل برآمد ہوتا ہے؟

اس علمی مذاکرے کے اختتام پر ہمیں توقع یہ ہوگی کہ ہم مندرجہ ذیل نکات پر اتفاق رائے پیدا کر لیں:

۱- فرد کی تعمیر (فرد کی تعلیم وتربیت) کے تصور پر اتفاق رائے پیدا کر لیں۔

۲- اتفاقِ رائے سے یہ بھی طے کر لیں کہ ہمارے تعلیم وتربیت کے موجودہ ادارے (رسمی اور غیر رسمی) فرد کی تعمیر میں کیوں ناکام ہیں۔

۳-فرد کی تعلیم وتربیت یا بالفاظ دیگر فرد کی تعمیر میں ہمارے معاشرے کے اجتماعی ادارے (مذہبی جماعتیں، سیاسی جماعتیں، مسجد وغیرہ کیوں ناکام ہیں)

۴-اس جامع حکمتِ عملی کو بروئے کار لانے کے لیے کس طرح کے ادارتی نظام کی ضرورت ہے؟

۶- مطلوبہ ادارتی نظام ممکنہ طور پر کس طرح تشکیل دیا جاسکتا ہے؟

۷- فرد کی تعمیر کا منصوبہ بظاہر ہر ایک طویل المیعاد منصوبہ ہوگا لیکن کیا کوئی وسط مدتی یا قلیل مدتی لائحہ عمل بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟

۸- فرد کی تعمیر کے لیے ادارتی نظام کی تشکیل وتنظیم کون کرے اور کس طرح کرے؟

۹- فرد کی تعمیر کے لیے معاشرے میں میسر وسائل کو درست خطوط پر کس طرح بروئے کار لایا جائے؟

۱۰- کیا کوئی میکانزم ترتیب دیا جاسکتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے اداروں کو مسلسل راہنمائی دی جاتی رہے جس پر ادارے رضا کارانہ طور پر عمل کریں؟

۱۱- فرد کی تعمیر کے حوالے سے ایک ماڈل ادارہ قائم کیا جائے جو آگے چل کر دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح Multiplier Effect ڈالے۔

اس اجلاس میں شرکاء نے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اجلاس ۱۰ بجے صبح سے لے کر عصر ۴ بجے تک جاری رہا لیکن اخذ نتائج کی نوبت نہ آسکی چنانچہ اجلاس ۱۴ دسمبر اتوار تک موخر کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں جن اصحاب علم ودانش نے شرکت کی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر انوار احمد بگوی (مصنف، محقق و سابق ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ پنجاب) نوید صدیقی صاحب (مصنف اور دانش ور، نعیم صدیقی مرحوم کے فرزند ارجمند) پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر (صدر شعبہ اسلامی تعلیم، پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر رشید احمد بگوی (پرنسپل منصورہ ڈگری کالج)، پروفیسر امجد وحید (یونیورسٹی آف مینجمنٹ وٹیکنالوجی)، پروفیسر سید وقار احمد کاری و پروفیسر شبیر احمد منصوری (اصلاح انٹرنیشنل) محمود اختر قریشی (تنظیم الاخوان)، محمد یحییٰ ایڈووکیٹ، عابد چوہدری، پروفیسر ملک محمد حسین اور راقم الحروف۔

علمی مذاکرہ کی دوسری نشست

۱۴ دسمبر کے اجلاس میں پروفیسر ملک صاحب نے کہا کہ:

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے البرہان میں مذکورہ بالا موضوع پر مقالہ کو زیر بحث لانے کے

لیے علماء فضلاء کی شراکت سے ایک یک روزہ مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی۔ شرکاء کی گفتگو کے نتیجے میں جو تجاویز سامنے آئیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔ ان تجاویز پر مزید بحث کے لیے 14 دسمبر بروز اتوار ایک مجلس منعقد ہوگی جس کے نتیجے میں ایک لائحہ عمل طے کیا جائے گا۔

1۔ فرد کی تعمیر کے میدان میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں لیکن اچھی خواہشات کے باوجود ان اداروں کی راہنمائی کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے نیز وہ تربیتی وسائل اور مواد قابلِ عمل صورت میں میسر نہیں ہے جسے کام میں لاکر تعلیمی ادارے (سکولز، کالجز، یونیورسٹیز) تعمیر فرد کا کام موثر انداز میں کر سکیں۔

تجویز ہے کہ صاحبانِ علم وفکر پر مشتمل ایک راہنما کونسل یا راہنما بورڈ تشکیل دیا جائے جو تعمیرِ فرد کے کام میں مخلصانہ رول ادا کرنے پر تیار اداروں کی راہنمائی اور اُن کے کارکنوں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دے۔

2۔ تعمیر فرد کے کام میں مخلصانہ مساعی کرنے کے لیے تیار اداروں کی سپورٹ کے لیے تربیتی، تعلیمی مواد بصورت ٹیکسٹ بکس، ٹیچرز گائیڈ، سٹوڈنٹس مینولز، جائزاتی شیڈولز تیار کیا جائے اور اداروں کو قیمتاً سپلائی کیا جائے۔

3۔ ایک ماڈل تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے تا کہ تعمیر فرد کے لیے تیار کی گئی ہماری حکمتِ عملی اور لائحہ عمل کے مفید، نتیجہ خیز اور قابل عمل ہونے کا کامیاب نمونہ پیش کیا جا سکے اور دیگر ادارے اُس ماڈل کا مشاہدہ کر کے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

لیکن اس دفعہ چونکہ بعض نئے اصحاب بھی اجلاس میں شرکت کی لہٰذا انہیں بھی گفتگو کا موقعہ دیا گیا۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر عارفین لودھی صاحب، پروفیسر ایمریطس فزکس یونیورسٹی آف ٹیکساس (حال یونیورسٹی آف مینجمنٹ وٹیکنالوجی، لاہور)، پروفیسر شاہد رشید صاحب (ایف سی کالج یونیورسٹی) عزیز احمد مرزا صاحب (معروف ماہر تعلیم)، زاہد اقبال صاحب (اسلام آباد)، محمد بن اشرف اور ذیشان صاحب (فیصل آباد)، خالد محمود صاحب (شعبہ تعلیم) ڈاکٹر سلیم بشیر صاحب (آرتھوپیڈک سرجن)، پروفیسر عبدالسلام چوہدری صاحب (ماہر تعلیم)، افتخار الدین منصور صاحب (دانشور اور مصنف)۔

یہ نشست ۲ بجے سے شام ۵ بجے تک جاری رہی اور بحث ومنافشے کے نتیجے میں ڈاکٹر سلیم بشیر صاحب کے ذمے یہ لگایا گیا کہ وہ 'ایجوکیشن واچ' کے حوالے سے ایک فورم کے قیام کا جائزہ اگلے اجلاس میں پیش کریں۔ اسی طرح پروفیسر شاہد رشید صاحب اور ڈاکٹر امجد وحید صاحب کے ذمے یہ لگا کہ وہ ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے فیزیبلٹی رپورٹ تیار کریں۔ اس علمی مذاکرے کا تیسرا اجلاس اتوار ۱۱ جنوری ۲۰۱۵ء کو منصورہ ڈگری کالج میں صبح دس بجے ہوگا، ان شاء اللہ۔

تبصرہ کتب

مختصر تبصرے

مسلمانوں کا فکری اغوا　　از مریم خنسا مرحومہ

مصنفہ نے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی کو فکری اغوا سے تعبیر کیا ہے اور اس کے اسباب میں ترقی پسندی، روشن خیالی، سیکولرزم، لبرلزم اور انسان دوستی کو شمار کیا ہے۔ فکری اغوا کے جن اہم مظاہر کو وہ زیر بحث لائی ہیں وہ یہ ہیں: انکار حدیث، ذرائع تبلیغ دین سے نفرت، تقسیم قومیت اور عصبیت، مسئلہ تہذیب وثقافت، ادب کا تخریبانہ استعمال اور افرادی اور دماغی قوت ختم کرنے کی کوشش ۲۷۰ صفحات کی یہ عمدہ کتاب دارالکتب السّلفیہ (غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور ۰۳۳۳-۴۳۳۴۸۰۴)، مکتبہ سلفیہ (شیش محل روڈ لاہور ۰۴۲-۳۷۳۱۴۱۸۴) اور مشربہ علم وحکمت (کامران پارک، زینبیہ کالونی، نزد منصورہ، ملتان روڈ، لاہور- ۰۳۰۰-۴۲۷۰۵۵۳) سے مل سکتی ہے۔

بچوں کی بنیادی اسلامی تعلیم: نصاب وطریق تدریس　　از ام عبد منیب

۳۲ صفحات کا یہ بروشر ان لوگوں کے لیے بہت دلچسپ اور مفید ہے جو چھوٹے بچوں کی اسلامی تعلیم وتدریس سے متعلق ہوں۔ قیمت ۲۵ روپے- ملنے کے پتے اوپر درج ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم اور نصابی صلیبیں　　از مریم خنساء وام عبد منیب

مغرب زدہ اذہان نے، خواہ وہ تعلیمی امور کی نگران بیوروکریسی اور حکمران ہوں یا پرائیویٹ سیکٹر کے نیم خواندہ دانشور اور علم فروش کاروباری حضرات، انہوں نے ہمارے نصاب میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے جو نصابی صلیبیں گاڑ رکھی ہیں ۱۲۴ صفحات کی یہ مختصر کتاب ان کا بہت اچھا پوسٹمارٹم کرتی ہے۔ دارالکتب السّلفیہ لاہور کے علاوہ شالیمار سنٹر F-8، مرکز اسلام آباد (۰۳۰۰-۵۲۰۵۰۵۰) سے بھی دستیاب ہے۔ قیمت ۷۵ روپے۔

اسلامی بنکاری - ایک تعارف　　از ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ - تدوین ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

اس کتاب میں سید عزیز الرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر غازی مرحوم کی ان تقریروں اور تحریروں کو جمع کر دیا ہے جو اسلامی بنکاری کے موضوع پر ہیں۔ اس میں بلاسود بنکاری کا پس منظر، اس حوالے سے قرآن و سنت کی تعلیمات، امت مسلمہ کا موقف، اس راستے کی رکاوٹیں، مسائل کی بنیاد، بلاسود بنکاری کے لیے کاوشیں، سودی بنکاری کے اسلامی متبادل اور موجودہ آئینی صورتِ حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۲۲۱ صفحات کی یہ

کتاب دارالعلم والتحقیق برائے اعلیٰ تعلیم وٹیکنالوجی نے (جی ہاں !اعلیٰ تعلیم وٹیکنالوجی ۔لیکن آپ فون کر کے ان سے یہ پوچھیے گا نہیں کہ انہوں نے ٹیکنالوجی میں کیا تحقیق وترقی کی ہے؟) زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۱۷-۴/۱۷، ناظم آباد۴-کراچی فون ۳۶۶۸۴۷۹۰-۰۲۱ سے شائع کی ہے اوراس کی قیمت ۱۸۰روپے ہے۔

وحدت امت-اسلام کا فراموش شدہ رکن از سید جوادنقوی

کلمۂ خیر کی تحسین کی جانی چاہیے خواہ کہنے والا کوئی بھی ہو۔مولف اہل تشیع کے جید عالم ہیں۔اپنی درسگاہ میں بھی وحدت امت کا ہفتہ ہر سال مناتے ہیں اور ملی مجلس شرعی سے بھی تعاون کرتے ہیں۔اہل سنت اوراہل تشیع کا اختلاف اپنی جگہ لیکن امام خمینی مرحوم نے انقلاب کے بعد وحدت امت کا نعرہ لگایا تو ان کی متابعت میں دوسرے شیعی اہل علم بھی ان کی لے میں لے ملانے لگے۔اب بدقسمتی سے حکومت ایران نے امریکہ سے مفاہمت کر لی ہے اورعراق،شام،بحرین،یمن،وغیرہ میں اس کا جو کردار ہے اس نے اسلامی یکجہتی کو شدید نقصان پہنچایا ہے اوراس پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔بڑی تقطیع پر ۴۹۱صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتی ہے اور یہ متاب پبلی کیشنز، جامعہ العروۃ الوثقی، چندرائے روڈ، لاہور سے دستیاب ہے۔اس پر قیمت درج نہیں۔

مغرب اوراسلام از پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خاں

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔اول:تحفظ واحیاء اسلام کے لیے نئی سمت وحکمت عملی۔دوم: زمانہ جدید کا اسلام کے بارے میں سوچ کا انداز وتاثر۔سوم:حکمت عملی کے خدوخال۔۲۸۰صفحات، قیمت ۲۵۰روپے۔اہتمام ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرکز تحقیقات۔گورنمنٹ کالج میر پور(آزاد کشمیر)۔ملنے کے پتے:کالج کے علاوہ مکتبہ جمال،حسن مارکیٹ تیسری منزل،اردو بازار لاہور(۰۳۰۰-۸۸۳۴۶۱۰) مصنف 'فکر مستقبل' کے نام سے جریدہ بھی شائع کرتے ہیں اور دیگر کئی کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔

عظمت قرآن اورعشق رسول کے نام اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کے افکار کے پردے میں مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کو مسلمانان پاکستان کے لیے قابل قبول بنانے کی ایک ملفوف کوشش۔

حکمت بالغہ جھنگ از انجینئر مختار فاروقی (مدیر)

یہ ماہنامہ قرآن اکیڈمی جھنگ شائع کرتی ہے۔فاروقی صاحب ان تھک لکھنے والے ہیں۔ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی فکر وتنظیم سے منسلک، تاریخ کا اچھا ذوق اورعلم رکھتے ہیں۔کئی ضخیم نمبر شائع کر چکے ہیں۔زیر تبصرہ شمارہ (نومبر۲۰۱۴ء)'ہندو مسلم نظریاتی کشاکش' پرخصوصی اشاعت ہے اور خاصی چشم کشا ہے۔یہ ۱۶۸صفحات پر مشتمل ہے اوراس کی قیمت ۱۵۰/ روپے ہے۔ شمارہ قرآن اکیڈمی، لالہ زار کالونی ۲،ٹوبہ روڈ جھنگ صدر(۰۴۷-۷۶۳۰۸۶۱) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خبریں و بریں

مختصر، اہم اور دلچسپ خبریں

[مع البرہان کا مختصر تبصرہ]

☆ پنجاب میں پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین (سابق وائس چانسلر یونیورسٹی آف گجرات) کو HEC پنجاب کا پہلا سربراہ مقرر کر دیا گیا [اب مرکزی HEC کیا کرے گی؟]

☆ عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ: ہر چالیس سیکنڈ میں ایک شخص خودکشی کرتا ہے۔ پچھلے سال ۸ لاکھ افراد نے خودکشی کی [جو تہذیب خلاف فطرت ہو، وحی کی ہدایت کو رڈ کرے اور نفس کو رہنما بنائے، اس کا یہی انجام ہوگا]۔

☆ ۱۳ سال بعد سپاہ صحابہ اور تحریک جعفریہ پر عائد پابندی ختم کر دی گئی [حکومت میں پہلے عقل تھی نہ اب ہے]۔

☆ لاہور میں پرائیویٹ سکولز ایسوسی ایشن نے اینٹی ملالہ ڈے منایا۔ سکولوں میں جلسے اور تقریریں ہوئیں اور ملالہ کی کتاب کی مذمت کی گئی جس میں ملعون سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسی نامی گرامی توہین رسالت کرنے والوں کی توصیف کی گئی ہے [شاباش - یہ کام سارے پاکستان کے سکولوں میں ہونا چاہیے]۔

☆ سٹیٹ بنک آف پاکستان نے ایک بین الاقوامی تحقیقی ایجنسی سے سروے کرایا ہے جس نے رپورٹ دی ہے کہ ۹۵ فیصد پاکستانی سود کا خاتمہ چاہتے ہیں اور بلاسود بنکاری کے حامی ہیں [کیا حکمرانوں نے بھی یہ خبر پڑھی ہے جو ان 'عوام' کے نمائندے ہیں]۔

☆ پشاور دھماکہ امریکہ نے کروایا۔ ایک SMS [ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن ایسی کوئی بات بلاتحقیق نہیں کہنی چاہیے]۔

☆ اقوام متحدہ کی تازہ رپورٹ: دنیا میں خوراک کی پیداوار عالمی ضروریات سے دگنی ہے [یہ بات پاکستان کے محکمہ فیملی پلاننگ والوں کو نہ بتانا اور نہ ان لوگوں کو جو تیسری دنیا خصوصاً پاکستان میں بھوک سے خودکشی کرتے ہیں]۔